جلد ۷۰ — اکتوبر ۱۹۶۸ء — عدد ۲

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مُرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرِ سالانہ : ۷ روپے — فی پرچہ : ۷۵ پیسے

جہادِ اسلامی

اسلام کے نظامِ جنگ پر

ایک منفرد کتاب

مؤلفہ خلیل احمد حامدی

مضامین ایک نظر میں

- مقاصد جہاد۔
- فضائل جہاد۔
- اقسام جہاد۔
- خواتین کا جہاد۔
- مراتب شہادت۔
- جہاد کی تیاری۔
- افواج اسلامی کے اجزاء۔
- اسلام کا نظامِ جنگ۔
- احکام جنگ۔
- صلوٰۃ خوف۔

ملّت اسلامیہ کے
ہر فرد خصوصاً
افواج اسلامی
کیلیے
ایک رہنما کتاب

اعلیٰ ایڈیشن -/۵ روپئے —— سستا ایڈیشن ۲/۷۵ روپئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ لاہور۔ فون ۶۸۳۴۱

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۰	اکتوبر ۱۹۶۸ء مطابق رجب ۱۳۸۸ھ	عدد ۲

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔اے، ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ماہ کے وسط میں صدرِ مملکت نے ایک غیر ملکی مصنفہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا "جس چیز سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں وہ قرآن حکیم کا تبحر اور اس کی عظمت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس اور اُن کی زندگی کلامِ پاک میں ارشاداتِ خداوندی کے اتباع کا عملی نمونہ تھی اور وہ خاتم المرسلین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ ہی کو اپنے ایمان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں"۔ صدرِ محترم کے بیان کا یہ حصّہ بڑا ایمان افروز ہے اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہیں اسلام اور حضور سرورِ دوعالمؐ سے گہری محبت ہے۔ ہم اپنے ایک مسلمان بھائی کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں اور اُن کی تصریحات کو محض الفاظ کی صناعی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے قلبی احساسات کی ترجمانی خیال کرتے ہیں۔ لیکن ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اسلام کے ساتھ آجکل جو بیت رہی ہے جب ایک طرف اُس کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف صدرِ محترم کے ان خیالات کو سامنے لاتے ہیں تو عجیب سی اُلجھن اور وحشت محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا بھی مشکل ہے کہ جنابِ صدر اس ملک میں بے بس ہیں۔ اور وہ ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو ایمان کا حقیقی سرچشمہ سمجھتے ہوئے، اُسے اپنے لیے اور قوم کے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہتے ہیں مگر اسلام کے دشمن اُن کی چلنے نہیں دیتے۔ ہم گذشتہ دس برس سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے سیاہ و سپید کے مالک ہیں اور جس شخص سے جو معاملہ چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں اور جن افکار و نظریات کو یہاں رواج دینا چاہتے ہیں، عوام کے منشا کے علی الرغم دے دیتے ہیں۔ اس بنا پر اسلام کے معاملے میں اُن کی بے بسی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ پھر ہماری عقل یہ بھی باور نہیں کر سکتی کہ وہ تو اسلام کو نافذ کرنے کے آرزومند ہیں مگر

قوم ملحدانہ افکار اور غیر اسلامی اقدار کو رواج دینے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے اور صدر مملکت کو اسلامی نظام کے قیام میں اس لیے تامّل ہو رہا ہے کہ اگر انہوں نے اسے قوت کے زور سے نافذ کر دیا تو قوم شدید مزاحمت کرے گی، اور اس طرح وہ باہمی کشمکش کا شکار ہو کر برباد ہو جائے گی۔ ہم قوم کے احساسات کا جہاں تک اندازہ کر سکے ہیں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک نہایت ہی قلیل طبقے کے سوا پوری قوم اس ایک بات پر آج بھی متحد و متفق ہے کہ یہ ملک جس مقدس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا ہے اس مقصد کو جلد سے جلد پورا کیا جائے کیونکہ اس ملک کی بقا اور فلاح کا راز صرف اسلام کی سچی پیروی میں مضمر ہے۔ قوم کے اس احساس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ اُس ردّعمل سے اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اسلام کے مطابق کام کرنے اور اُس کے خلاف کرنے سے اس قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ بیس سال کی مدّت کوئی ایسی طویل مدت نہیں جس کا احاطہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ اسے سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ اسلام کی پکار پر اس قوم نے کس جوش اور کس ولولے کے ساتھ لبیک کہا اور پھر اس کے لیے کس بے مثال ایثار کا ثبوت دیا اور اس کے خلاف کسی غیر اسلامی نظریے کی دعوت اور کسی جاہلیت کے نعرہ کو کس شدید اضطراب کے ساتھ سنا اور کس شدید کرب کے ساتھ برداشت کیا۔ لہٰذا یہ بات کہ قوم اسلام کو اپنانے پر آمادہ نہیں اور صدر مملکت قومی مصالح کے تحت اسے اُس پر ٹھونسنا نہیں چاہتے، اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔

خدا کو لوگوں نے دیکھا نہیں بلکہ اُس کی قدرت سے اُس کو پہچانا ہے۔ اسی طرح محبت و عقیدت گو ایک غیر مرئی جذبہ ہے لیکن یہ اپنے اظہار کے لیے محسوس راستے ہی اختیار کرتا ہے۔ جو فرد یا قوم جن افکار و نظریات سے محبت کرتی اور جن شخصیتوں کی عقیدت کا دم بھرتی ہے اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں، اُس کے پسند و ناپسند کے معیارات میں اور اس کے طرزِ عمل میں ان افکار و نظریات کی نسبت سے بعض نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے مؤثر تبدیلی یہ ہے کہ وہ فرد یا قوم اپنے پسندیدہ اور محبوب تصورات کے مقابلے میں کسی دوسرے تصور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی بلکہ جو افکار اس کی ضد ہوتے ہیں انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ قوم اپنے پسندیدہ نظریات کو نہ صرف دل و جان سے اپناتی ہے بلکہ اُن کی سربلندی کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے

بھی دریغ نہیں کرتی۔ محبت کوئی بے حس اور بے کیف جذبہ نہیں جو سینے کے کسی اُجڑے ہوئے گوشے میں یونہی نیم مُردہ حالت میں پڑا رہے۔ یہ بڑا متحرک اور مؤثر جذبہ ہے جو انسان کی پوری زندگی میں انقلاب برپا کرتا ہے، بے حسی اور محبت دو متضاد کیفیات ہیں جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ انسان کو جس نسبت سے کسی چیز یا نظریے سے محبت ہو گی اسی تناسب سے اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہو گا کہ وہ اپنی محبوب شئے یا نظریہ کو دنیا کی ہر دوسری شئے یا نظریے پر غالب دیکھے اور جو اشیاء یا نظریات اس کی ضد ہیں انہیں یا تو مٹا دے یا اس کے مقابلے میں بالکل بے وزن کر کے رکھ دے۔ محبّت کے جذبے کے اندر غیرت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، اس جذبے میں سرشار انسان اس بات کو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا تصور اس کے محبوب تصور کے مقابلے میں اُبھر سکے۔ پھر یہ جذبہ بڑا حسّاس بھی ہوتا ہے۔ جونہی کوئی معمولی سی جنبش اس کے خلاف پیدا ہوتی ہے تو یہ فوراً انسان کو مضطرب کر دیتا ہے اور اس وقت تک اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک کہ حالات معمول پر نہ آجائیں اور خطرہ پوری طرح ٹل نہ جائے۔

مسلمانوں کے اس دورِ انحطاط میں یوں تو عوام کے اندر بھی بالعموم اسلام کے ساتھ سچی محبت اور عملی وابستگی کم ہوتی جا رہی ہے ورنہ وہ غیر اسلامی افکار اور عادات کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اندر گوارا نہ کرتے۔ لیکن اس بارے میں برسرِ اقتدار طبقوں کی بے حسی تو حد درجہ تشویشناک ہے۔ صدر محترم نے اسلام سے گہرے تعلقِ خاطر کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر ہم بصد احترام مگر بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلام کے معاملے میں انہوں نے اور اُن کی حکومت نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اُس سے دینی احساس و شعور رکھنے والے عوام و خواص میں سخت بے اطمینانی اور بے چینی پھیل رہی ہے۔ چنانچہ ہم ان صفحات کے ذریعے ان کی توجہ چند امور کی طرف دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اسلام کی محبت کی خاطر وہ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب "اسلام" پر پورے ملک میں جو اضطراب پیدا ہوا ہے اس کی وجوہ

سے صدرِ مملکت اور اُن کی حکومت ناواقف نہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اسلامی معتقدات سے ہم آہنگ نہیں۔ چنانچہ ان کی حکومت نے اچھا کیا کہ اس شخص سے گلو خلاصی حاصل کی اور عوام کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو ایک حد تک بروقت فرو کر دیا۔ مگر اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں فطری طور پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہاں مسندِ اقتدار پر غیر مسلم متمکن ہوتے تو مسلم عوام کو دینی معاملات میں یہی روش اختیار کرنا چاہیے تھی یعنی جب کوئی خلافِ دین بات اُن کے سامنے آتی تو وہ علانیہ طور پر غم و غصہ کا اظہار کرتے اور حکومت کو بتاتے کہ فلاں فلاں معاملے میں اُن کے مذہبی احساس کو ٹھیس پہنچی ہے اس لیے اس کے تدارک کی فکر کی جائے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں خدا کے فضل سے زمامِ کار اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اسلام سے گہری محبت اور عقیدت ہے جنہیں اسوۂ رسولؐ سے والہانہ عشق کا دعویٰ ہے اور جو اس اسوۂ حسنہ کے اتباع ہی میں نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری نوعِ بشری کی فلاح و کامرانی کا راز پاتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس درجہ وابستگی کے ہوتے ہوئے کسی فتنے کے تدارک کے لیے عوام کی طرف سے اس قدر شدید تقاضے کا منتظر رہنا یا اس تک نوبت پہنچنے دینا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاید صدرِ مملکت کو اس فتنے کا علم ہی نہ ہو۔ مگر یہ بات بھی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ جس مقتدر شخصیت کا نظامِ جاسوسی و سراغرسانی اتنا مضبوط ہے کہ وہ ہر اُس فرد یا گروہ پر کڑی نگاہ رکھتا ہے جو صدرِ محترم سے ذرا اختلاف کی جرأت بھی کرے اور پھر اس کی بنیاد پر اُس کی حکومت ایسے افراد اور گروہوں پر عتاب بھی نازل کرتی رہتی ہے اور انہیں راہِ راست پر لانے یا بے اثر بنانے کے لیے بڑے مؤثر اقدام بھی کرتی رہتی ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ اُسے دین کے خلاف فتنوں کا صحیح علم نہیں ہونے پاتا بالکل ناقابلِ یقین ہے۔ صدرِ مملکت نے اپنی انتظامی مشینری کو جس سانچے میں ڈھالا ہے اُس کی استعدادِ کار میں کسی اور پہلو سے اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر اس پہلو سے ضرور اضافہ ہوا ہے کہ جو لوگ ذرا بھی اُن سے مختلف انداز سے سوچتے ہیں اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے یا کم از کم انہیں ملک کے اجتماعی معاملات

میں بالکل بے اثر بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس مستعد مشنیری کے ہوتے ہوئے یہ قیاس کرنا کہ انہیں شاید ان فتنوں کی اطلاع نہیں ہوتی، ناقابلِ فہم ہے۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جن افکار و خیالات کے علمبردار ہیں، وہ کوئی ایسے خیالات نہیں جو دفعتہً صدرِ مملکت کے سامنے آئے ہوں۔ وہ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہوسکتے کہ جس اسوۂ رسولؐ سے انہیں محبت ہے اس اُسوہ کے خلاف یہاں ایک گروہ باقاعدہ سازش کر رہا ہے۔ اور جس اُسوہ کی اتباع کو وہ اپنے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے فلاح کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ اُس کے بارے میں یہاں گزشتہ چند سال سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت یہ تاثر قائم کیا جا رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و افعال کا جو ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے، اور جس کی وساطت سے ہم حضورؐ کا اسوۂ حسنہ معلوم کرسکتے ہیں، بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ گروہ پوری بیباکی کے ساتھ اس قسم کے باطل افکار کو مسلسل کئی برس سے پھیلا رہا ہے مگر اس گروہ کی سرگرمیوں پر کبھی ایک مرتبہ بھی گرفت نہیں ہوئی بلکہ حکومت بعض حالات میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اس کا لٹریچر مختلف دفاتر میں بڑی آزادی کے ساتھ پہنچتا ہے اور حکومت کے بعض اونچے عہدیدار اس کی اشاعت میں کھلے بندوں حصہ لیتے ہیں۔ اور تو اور خود صدرِ محترم کے دستِ راست اور مرکزی کابینہ کے وزیر تک اس کے اجتماعات میں شریک ہو کر اس کے خیالات کی تائید کرتے ہیں اور پھر اُن کی اس تائید کو سرکاری نشر و اشاعت کے مختلف اداروں کے ذریعہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پھیلایا جاتا ہے۔

صدرِ مملکت نے اپنی تصریحات میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کلام پاک میں ارشاداتِ خداوندی کے اتباع کا مکمل نمونہ تھی اور وہ ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشادات اور افعال اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے سارے گوشوں کو آیاتِ الٰہی کی عملی تفسیر سمجھتے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ حضورؐ کا ہر قول اور ہر فعل منشاءِ الٰہی کی ترجمانی کرتا ہے اور اُس پر دل و جان

سے ایمان اور اس کی پیروی کی سچی آرزو ہی اسلام کا بنیادی اقتضا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں ہم پھر گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم یہ دیکھیں کہ یہاں عملاً کیا ہو رہا ہے۔ یہاں ایک گروہ ایسا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد نبوت کے اجرا کا قائل ہے اور فی الحقیقت ایک دوسرے شخص کو نبی مانتا ہے۔ اور اُس کی ذات، اُس کے خاندان اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ محبت و عقیدت کے وہی جذبات رکھتا ہے جو امتِ مسلمہ ختم المرسلین کے ساتھ رکھتی ہے۔ صدرِ مملکت جیسے صاحب فہم و فراست اور اقبال کے شیدائی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ کسی شخص کی نبوت پر ایمان لانے کے کیا معنی ہیں اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذاتِ اقدس پر آدمی ایمان لاتا ہے اُسے وہ اپنی ساری محبت اور عقیدت کا محور سمجھتا ہے اور اس بات کا پختہ یقین رکھتا ہے کہ یہ ذات جو کچھ کہہ رہی ہے یا کر رہی ہے وہی منشائے الٰہی ہے۔ اس بنا پر وہ اس ذات پاک کے سارے ارشادات اور افعال کو دین میں حجت تسلیم کرتا ہے اور ان کے مقابلے میں ہر دوسرے فرد یا گروہ کی ہر بات کو باطل سمجھتا ہے۔ کیونکہ نبی کے قول و عمل اور اسوہ کا اتباع ایمان کی خشتِ اوّل ہے۔

اب اگر ایک فرد یا گروہ حضور سرور دو عالم کے بعد کسی دوسرے انسان کو نبی مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی عقیدت کا مرکز حضور سرور کائنات کی ذات گرامی نہیں بلکہ یہ دوسرا شخص ہے جسے اُس نے بعد میں نبی تسلیم کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کے نزدیک فیصلہ کُن اہمیت اس دوسرے شخص کو حاصل ہے اور اس کی باتوں کو وہ دین میں حجت سمجھتا ہے اور ان کے اتباع کو ہی اپنے ایمان کا اقتضا قرار دیتا ہے۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ انسان اصل اہمیت اُس نبی کی تعلیمات کو دیتا ہے جسے وہ اپنے زمانے سے قریب تر پاتا ہے۔ چنانچہ اس ملک میں جو لوگ حضور ختم الرسلؐ کے بعد کسی دوسری نبوت کے قائل ہیں ان کی زندگی کا انداز امتِ مسلمہ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے لیے عین تقاضائے ایمان ہیں، ان کے نزدیک وہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ بعض کو تو انہوں نے حرام قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کا پورا نظام اس نئی نبوت، اس کے مزعومات، اور اس کے خاندان کے گرد گھومتا ہے۔

حضور نبی آخر الزّمان کی نبوت پر ایمان رکھنے والے اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے محبت کے دعویدار سے آخر اس بات کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نبوت کے ان واضح مقتضیات و مسائل کو نہ سمجھتا ہوگا اور اس کی نگاہ سے یہ باتیں اوجھل ہونگی۔ ممکن ہے یہاں کوئی صاحب یہ کہیں کہ پاکستان میں ہر اُس شخص کو عزت کے ساتھ جینے کا حق ہے جو قانون کا احترام کرتا ہے۔ ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے ایک جائز اور معقول موقف سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس حق کا مطلب آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ اس گروہ کے افراد کو کلیدی مناصب سونپ دیئے جائیں۔ اور وہ اندرونِ ملک و بیرونِ ملک جو چاہیں کرتے پھریں۔ ممکن ہے کہ اس گروہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایک مخصوص بلاک سے ہمیں چند مادّی مراعات اور قرضے بھی حاصل ہو سکیں اور اندرونِ ملک بھی اس کی خوشامدانہ روش کی وجہ سے اقتدار کے جذبۂ خوشامد پسندی کی تسکین بھی ہو جاتی ہو۔ لیکن سوچنا چاہیے کہ اندرونِ ملک اس گروہ کا بڑھتا ہوا عمل دخل حضور سرورِ کائنات کے اسوۂ حسنہ کے مرتبہ و مقام پر کیا اثر ڈالے گا۔ حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں ہمیں زندگی کے سارے گوشوں کے لیے واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس اسوہ سے جہاں ہمیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور اوراد و وظائف کے متعلق رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہاں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور سرورِ دوعالم نے اجتماعی امور کے بارے میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے۔ مسلمان قوم کو دشمن کے ساتھ نمٹنے کے لیے کیا اصول عطا فرمائے ہیں، استعماری طاقتوں کے معاملے میں کونسی روش اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ کیا اس گروہ کے تسلط کے بعد، جو مذہب اور سیاست کی تفریق کا علمبردار ہے، حکومت کے لیے ممکن ہے کہ وہ حضور سرورِ کائنات کے اسوۂ حسنہ کو زندگی کے اجتماعی معاملات میں بھی اپنا رہنما بنا سکے ؟

صاحبِ صدر کی تصریحات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ قرآن کی ساری تعلیمات کو اور حضور سرورِ کائنات کے ارشادات کو قیامت تک کے لیے دین میں حجت سمجھتے ہیں اور اس میں کسی تغیر و تبدل یا تنسیخ و ترمیم کے قائل نہیں۔ وہ جب یہ بات مانتے ہیں کہ قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اور حضورؐ خدا کے آخری نبی ہیں اور انہوں نے زندگی میں جو کچھ فرمایا یا کیا وہ خدا کے منشا کا اظہار تھا تو اس سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آ جاتی ہے کہ

کتاب وسنت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ قیامت تک واجب الاتباع ہے اور کوئی فرد، یا گروہ یا ادارہ یا پوری نوعِ بشری مل کر بھی اس میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ صدر مملکت کا کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ موقف بالکل درست ہے، کیونکہ فرامینِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ کے اندر کوئی شخص کسی ترمیم کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس ملک میں ان ناقابلِ تغیر تعلیمات کے بارے میں جو گمراہ کن نظریات پھیلائے جا رہے ہیں اور قرآن وسنت کے احکام کو جس طرح وقتی اور ہنگامی ثابت کیا جا رہا ہے، اُسے کوئی صاحبِ ایمان ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کر سکتا۔ اس ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان اصولوں کی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے عہد کے مطابق اور اپنے ملکی حالات کے پیشِ نظر کچھ اصولوں سے لوگوں کو آشنا کیا لیکن اب یہ اس بیسویں صدی میں کسی اہمیت کے حامل نہیں۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں تک کہنے کی جسارت کی کہ آخر یہ کس قدر حماقت ہے کہ جو اصول ایک نیم وحشی معاشرے کے لیے وضع کیے گئے تھے اُن سے آج کی مہذب سوسائٹی کو ہدایت اور رہنمائی لینے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

جو لوگ اس معاملے میں ذرا محتاط ہیں وہ اسی بات کو ایک دوسرے انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کا قرآنِ حکیم کے بارے میں یہ موقف ہے کہ اس میں دو قسم کی تعلیمات پائی جاتی ہیں، ایک ابدی اور دوسری وقتی۔ پھر ابدی تعلیمات کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ یہ صرف تین چار بنیادی حقائق کا مجموعہ ہیں۔ مثلاً توحید باری تعالیٰ، احترامِ انسانیت۔ اور عقل کی فضیلت۔ ان اصولوں کے علاوہ قرآنِ مجید میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کی حیثیت وقتی ہے۔ قرآن کے یہ اصول اور ضابطے اُس وقت کے عرب معاشرے کے لیے تو بڑے مفید اور کارآمد تھے لیکن اب یہ بیکار کی زنجیریں ہیں۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت قرآن کے قوانین کو ناقابلِ عمل ٹھیرایا جاتا ہے۔

حدیث کے معاملے میں بھی ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے عہد میں جو کچھ ارشاد فرمایا یا کیا، وہ صرف اُس وقت کی ایک ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد اُس کی حیثیت محض

ایک تاریخی ریکارڈ کی سی رہ جاتی ہے جس پر مختلف زاویوں سے تحقیق کی جاسکتی ہے لیکن دنیائے عمل میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ امتِ مسلمہ کو اب اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنی چاہیے اور اس "قصہ پارینہ" کو درمیان میں لاکر اپنی ترقی کی رفتار میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہیے۔

یہ ہیں قرآن و سنت کے بارے میں وہ خیالات جو الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ تجدد پسند حلقوں کی طرف سے پیہم پیش کیے جارہے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کسی اخبار یا رسالے میں یا کسی تقریب میں اس قسم کے باطل تصورات کا اظہار نہ کیا جاتا ہو۔ ایک طبقے کی طرف سے ملک میں یہ ہنگامہ برپا ہے کہ دین کو وقت کے مطابق ڈھالو اور اس کے اصولوں میں ضروریاتِ وقت کے مطابق تغیر و تبدل پیدا کرو۔

ملک کے موجودہ حالات میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ صدرِ مملکت کے کان ان ہنگاموں اور شورشوں سے نا آشنا ہوں گے۔ بلکہ بعض اوقات اُن کی اپنی زبان سے ایسی باتیں سُنی گئی ہیں جن سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ خود بھی ان افکار سے متاثر ہیں۔ لیکن اب انہوں نے جو بیان دیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات ہی کو حق کا واحد سرچشمہ سمجھتے ہیں اور ان میں کسی تبدیلی کے قائل نہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو مگر یہاں بھی ذہن میں یہ الجھن رہ جاتی ہے کہ جب اُن کا موقف یہ ہے تو پھر ایسے لوگوں کی حکومت کے ایوانوں میں کیوں پذیرائی ہورہی ہے جو کتاب و سنت کی تعلیمات کو وقتی اور ہنگامی چیزیں کہہ کر انہیں بے وزن بنانے کی مذموم کوششیں کر رہے ہیں۔ صدرِ مملکت جیسے دانا آدمی کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون اور خدا کے دیئے ہوئے قانون کے درمیان فرق یہی ہے کہ انسانی قانون چونکہ محدود علم اور محدود بصیرت رکھنے والے فرد یا افراد کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لیے وہ ایک وقتی ضرورت کو پورا کرتا ہے لیکن جو قانون انسانیت کو علیم و خبیر سمیع و بصیر ہستی عطا کرتی ہے وہ ابدی ہوتا ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم خداوند تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جو قیامت تک انسانوں کے لیے اپنے اندر ہدایت کا پورا سامان رکھتی ہے اور حضور سرورِ کائنات کا اُسوہ حسنہ وہ آخری اُسوہ ہے جس کی اتباع پوری انسانیت کے لیے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ جو شخص یا گروہ ہدایت و رہنمائی کے ان دو سرچشموں کو وقتی اور ہنگامی کہتا ہے وہ درحقیقت یا تو قرآن کے منزل من اللہ اور رسول کے رسولِ خدا ہونے کا منکر ہے یا خدا کے بارے میں نہایت غلط قسم

کے تصورات رکھتا ہے۔ وہ خدا کو بھی انسانوں پر قیاس کرکے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا علم اور اس کی بصیرت بھی محدود ہے اس لیے وہ انسان کو ایسے قوانین دیتا ہے جن کی افادیت عارضی ہے اور وقت کے گزرنے کے بعد وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ خدا اور اُس کے رسول کی تعلیمات کو وقتی اور ہنگامی کہنا درحقیقت خدا کے علیم و بصیر ہونے کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ کوئی صاحبِ ایمان ان باطل اوہام کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا مگر ہمارے ملک میں چند بد باطن لوگ آئے دن اس قسم کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اور حکومت ان پر کوئی گرفت نہیں کرتی۔ بلکہ بعض حالات میں ان کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی تازہ مثال ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب کے بارے میں اس کا فیاضانہ طرزِ عمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی غیر معروف شخصیت نہیں کہ صدرِ مملکت اور اعیانِ حکومت کو اُن کے خیالات کا پتہ نہ ہو۔ انہیں مرکزی حکومت میں بھاری مشاہرے پر شعبۂ تحقیقاتِ اسلامی کی زمامِ کار اُن کی استعداد اور قابلیت کی بنا پر ہی سونپی گئی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ انتخاب کے وقت اُن کی ڈگریوں اور سابقہ تجربے کے ساتھ ان کی تصنیفات اور مقالات بھی سامنے آئے ہونگے۔ انہیں دیکھنے سے اُن کے خیالات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کہ انہیں یہ اہم اور نازک ذمہ داری سونپتے ہوئے یہ معقول راستہ کیوں ترک کر دیا گیا۔ وزراء، سفراء کا تقرر تو خیر بڑی بات ہے، معمولی معمولی عہدیداروں کو منتخب کرنے وقت ان کے ماضی کی جانچ پڑتال، اُن کے فکری رجحانات، حکومت کے بارے میں اُن کے میلانات کی اگر چھان بین ضروری خیال کی جاتی ہے تو تحقیقاتِ اسلامی کے ناظم کا انتخاب کرنے کے لیے یہ چھان بین کہیں زیادہ ضروری تھی۔ ایک صاحبِ ایمان کے لیے اسلام، اُس کی جان و مال، عزت و آبرو، شہرت و اقتدار سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں اس انتخاب کے وقت ایمان کے اس بنیادی تقاضے کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اس ادارے کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد وہ روش اختیار کی جس کا ایمان متقاضی تھا بلکہ انہوں نے اسلام کے اساسی تصورات سے لے کر اُس کی معمولی سے معمولی جزئیات تک کے بارے

میں نہایت غلط افکار کی نشر و اشاعت شروع کی۔ ملک کے اصحاب علم نے ان پر سخت گرفت بھی کی اور ان کی غلطیوں کو دلائل سے واضح کیا لیکن حکومت نے کسی کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ڈاکٹر صاحب اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ ہمیں یہاں یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ اقتدار سے اگر کوئی ذرہ برابر اختلاف بھی کرے تو اُس کے وجود کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کیا جاتا اور اسے بیک بینی و دوگوش نکال دیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کسی مروت، کسی سابقہ تعلق کی پروا بھی نہیں کی جاتی مگر اسلام کے بارے میں ہمارے حکمران طبقہ کی حس اور غیرت بہت کم بیدار ہوتی ہے۔ یہاں اقتدار کے سایۂ عاطفت میں رہ کر جو کوئی اسلام کے خلاف جو سازش چاہے کرتا رہے، کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ صدرِ مملکت اور اُن کی حکومت کے خلاف ذرا ذرا سے اختلافات اور ہلکی سی تنقید پر رسالے اور کتابیں ضبط ہوتی ہیں اور معاملہ زبان بندیوں، نظر بندیوں اور ضبط املاک تک پہنچتا ہے۔ لیکن اسلام کے خلاف ہنگامے اٹھانے والوں پر قطعاً کوئی گرفت نہیں کی جاتی۔ کیا یہ صورتِ حال اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتی کہ صدرِ مملکت اور اُن کے رفقائے کار کی نظر میں اسلام اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اُن کا اقتدار۔ جس اسلام کی محبت کے وہ دعویدار ہیں اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے میں کسی چیز کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ کیونکہ جان و مال، عزت و اقتدار تو عارضی چیزیں ہیں، اور ان کے مقابلے میں ایمان ابدی فلاح و سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اس بنیادی حقیقت کا صدرِ مملکت نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انہوں نے اچانک نہیں اپنائے۔ وہ کئی سال تک مسلسل اسلام کے مسلمہ اصولوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے حدیث کے خلاف بڑے گمراہ کن نظریات پیش کیے اور اس کے بارے میں ایک ایسا موقف اختیار کرنے کی تلقین کی کہ اگر اُسے قبول کر لیا جائے تو دین میں اس کی حجیت یکسر ختم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اسلامی سزاؤں، حدودِ شرعی، حرام و حلال کے معیارات، سُود اور شراب اور ذبیحہ کے بارے میں نہایت غلط باتیں کہیں مگر حکومت نے ان کی ان کارگزاریوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے انہیں بھاری معاوضہ دیا جاتا رہا اور انہیں یہ آسانیاں پہنچائی گئیں کہ وہ سرکاری اخراجات پر ان مذموم افکار کی اشاعت کریں۔ اب جبکہ انہوں نے اپنے سارے افکار کو سمیٹ کر پوری وضاحت کے ساتھ ایک کتاب میں بیان کیا اور عوام کے سامنے یہ بات کھل کر آئی کہ شعبۂ تحقیقات اسلامی کے ناظم اسلامی معتقدات کا کیا حلیہ بگاڑ رہے ہیں تو عوام میں بالکل فطری طور پر اضطراب پیدا ہوا۔ مگر حکومت نے انہیں کچھ کہنے کے بجائے نہایت سطحی قسم کے دلائل کے ساتھ مدافعت شروع کی کبھی یہ کہا جاتا کہ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۵۵ء میں لکھی تھی جب کہ وہ اس ادارہ سے وابستہ نہ تھے لیکن کتاب پر جہاں ان کا نام بحیثیت مصنف درج ہے وہاں ناظم ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی لکھا ہوا ہے۔ پھر ایک وزیر با تدبیر نے تو اُن کے لیے ایک پریس کانفرنس بلوائی اور اس کے بعد انہوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حق میں جو صفائی پیش کی ہے وہ اس سے بالکل مطمئن ہو گئے ہیں اور اب اُن کے ذہن میں کوئی خلش باقی نہیں رہی۔ وزیر صاحب کی یہ روش بھی ناقابلِ فہم تھی۔ جب حکومت یہ موقف اختیار کرتی ہے کہ اس کتاب کا سرکاری پالیسی سے کوئی تعلق نہیں تو پھر انہیں ڈاکٹر صاحب کی صفائی کے لیے اتنی سرگرمی دکھانے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ اس سے تو یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور انہوں نے اس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے حکومت انہیں کسی طرح بھی تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ ہمارا یہ احساس کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے کچھ ٹھوس وجوہ ہیں اور ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جو اساسی تصور پیش کیا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق برسرِ اقتدار طبقے کی بعض نہایت اونچی شخصیتیں اظہار خیال کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات پر گذشتہ ترجمان القرآن میں بحث کی جا چکی ہے یہاں ہم بڑے اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ موصوف کا اصل مدعا کیا ہے۔ اُن کا حقیقی مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام کے آئین و ضوابط کی حیثیت مستقل اور پائیدار اقدار کی نہیں بلکہ محض ہنگامی اور عارضی ہے۔ اور ان میں حالات کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ان خیالات کے بارے میں جو توضیحی بیانات دیئے ہیں اُن میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے۔ وہ جن باتوں کو مستقل اور پائیدار تسلیم کرتے ہیں وہ قرآن مجید کے چند معتقدات ہیں یا اسلامی قوانین کی مجرد روح ہے۔

باقی جہاں تک قوانین اور ضابطوں کا تعلق ہے وہ اب بھی اُن کے بارے میں وہی موقف رکھتے ہیں جو انہوں نے اپنی تصنیف میں اختیار کیا ہے۔ ان ضوابط کو عارضی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے یہ فلسفہ گھڑا ہے کہ قرآن حضور کے ایسے گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھا جب اُن کی فکر کائنات کے اخلاقی اصول سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مستقل اور پائیدار چیز کائنات کا اخلاقی اصول ہے جو خود قوانینِ فطرت سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے نظامِ شریعت حق و باطل کا معیار قرار پانے کے بجائے قانونِ قدرت معیار قرار پاتا ہے۔ قوانینِ قدرت کو رہنما بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اصل اہمیت وحی کے بجائے تجربے، مشاہدے اور عقل کو حاصل ہو اور ان کی روشنی میں اقدارِ حیات اور نظامِ زندگی کو وقت کے مطابق تبدیل کیا جا سکے۔ یہ وہ بنیادی تصور ہے جو اس پوری کتاب میں اوّل سے لے کر آخر تک کارفرما ہے۔

اس تصور کے مقابلے میں اسلام یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ حق و باطل کا معیار تجربہ، مشاہدہ اور عقل نہیں بلکہ وحی ہے، کیونکہ علم کے یہ تینوں ماخذ اپنے بل بوتے پر انسانی زندگی کے لیے کوئی متوازن نظام تشکیل نہیں دے سکتے۔ انسان کی صحیح رہنمائی کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ عقل اور تجربے سے جہاں تک ہو سکے استفادہ تو کیا جائے مگر ان سے جو نتائج اخذ کیے جائیں ان کی صحت کو وحی کی روشنی میں پرکھ لیا جائے کیونکہ وحی ہی انسانی ہدایت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو نہ صرف ہر خطا سے پاک ہے، بلکہ مستقل قدر و قیمت کا حامل ہونے کی وجہ سے ہر عہد اور دور میں واجب الاتباع بھی ہے۔

حکومت جس طرح دینی افکار اور نظریات کے بارے میں بے حس ہے، اس سے کہیں زیادہ دینی اقدار اور دینی روایات سے بے تعلق نظر آتی ہے۔ اسلام کا ایک سچا خادم ہونے کی وجہ سے صدرِ مملکت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن بھلائیوں کو فروغ دیں جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کو مٹانے کی فکر کریں جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی صورتِ حال کسی اعتبار سے بھی قابلِ اطمینان نہیں بلکہ بعض معاملات میں تو بڑی تشویشناک نظر آتی ہے۔ ایک مسلم حکومت اور اس کے مسلمان سربراہ پر خدا کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو نیکی

اور بھلائی کی ترویج اور برائی کے استیصال کے لیے استعمال کرے۔ اس حقیقت کی قرآن مجید نے یوں وضاحت کی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (الحج - ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔

یہ آیت مسلمان حکمران کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ کسی مسلمان حکومت کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ ملک کو بیرونی خطروں سے بچائے اور داخلی شورشوں سے محفوظ رکھے بلکہ دین کے معاملے میں بھی اُس پر ایک ایسی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو دوسری ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ مثبت طور پر اس کا فرض یہ ہے کہ وہ ملک کے اندر نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے اور یہ دیکھے کہ مسلم سوسائٹی میں نیکی اور بھلائی برابر پروان چڑھ رہی ہے یا نہیں۔ اگر حکومت اس بنیادی فرض کے بجا لانے میں غفلت سے کام لے رہی ہے تو اس کی باقی منصوبہ بندیاں اور کارگزاریاں ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ مسلم حکومت کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اُن ساری برائیوں کے تدارک کا التزام کرے جنہیں اسلام ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جن کا وجود دینی نقطۂ نظر سے مضرت رساں ہے۔

صدرِ مملکت جیسے محبِ اسلام اور محبِ رسول کے بارے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک سربراہ کی حیثیت سے اپنی دینی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوں گے۔ انہوں نے اپنی کتاب "دوست نہ کہ آقا" میں اسلامی نظامِ حیات، اور اسلامی قانون کے بارے میں مختلف مقامات پر جو مباحث اٹھائے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان مسائل پر بحیثیت مسلمان خوب غور کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس غور و فکر میں ایک مسلمان سربراہ مملکت کی دینی اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی یقیناً اُن کے سامنے آئی ہوں گی

اور ان کے بارے میں بھی انہوں نے ضرور غور و خوض کیا ہوگا لیکن ہمیں یہاں بھی بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا غور و خوض کسی ٹھوس نتیجے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والا اور قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ کو سرچشمۂ ہدایت ماننے والا سربراہ آخر دین کے معاملے میں وہ غیر جانبدارانہ طرزِ عمل کیونکر اختیار کر سکتا ہے جو ایک لادینی ریاست کا طغرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ لادینی ریاستیں بھی مذہب کے بارے میں کبھی غیر جانبدار نہیں رہیں بلکہ وہ اس میدان میں ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں جس سے کسی مذہب کو تقویت اور کسی کو نقصان پہنچتا ہے۔ جب لادینی ریاستوں اور ان کے بے دین سربراہوں کا یہ حال ہے تو اسلامی جمہوریہ اور اس کے مُحبِّ اسلام سربراہ کو تو دین کی سربلندی اور غیر اسلامی رجحانات اور روایات کے قلع قمع کرنے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس باب میں یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ بڑا مایوس کن ہے۔ بعض جلسوں اور تقریبات میں صدرِ مملکت اور ان کے رفقاءِ کار کی زبانوں سے اسلام کی مدح و توصیف میں کبھی کبھی چند رسمی کلمات تو ضرور سن لیے جاتے ہیں لیکن اس اسلام کے نفاذ کے لیے قطعاً کسی قسم کی کوئی تحریک نہیں ہوتی۔ آئے دن مختلف محکموں اور ان کے ناظمین کو مختلف ہدایات جاری ہوتی رہتی ہیں لیکن ان میں کبھی ایک مرتبہ بھولے سے بھی اس بات کا ذکر تک نہیں آیا کہ انہیں نماز کی پابندی، شعائرِ اسلام کا احترام اور منکرات سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفاتر میں بے دین عناصر نہ صرف کھلم کھلا احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور کوئی انہیں ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ اور آخر ٹوکے بھی کون؟ کیونکہ جو لوگ انہیں ٹوکنے کی پوزیشن میں ہیں وہ تو خود فکر و عمل کے اعتبار سے اس بے دین گروہ کے ہم مسلک و ہم مشرب ہوتے ہیں اور ان کی شہ پر تو یہ گروہ اس قسم کی بیہودگیاں کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

معاملہ پھر اس پر ختم نہیں ہوتا کہ اس ملک میں اسلام کی پیش کردہ بھلائیوں کو پھیلانے اور منکرات کو مٹانے کی کوئی فکر نہیں کی جا رہی بلکہ یہاں حکومت نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت بُرائیوں کو پھیلایا جا رہا ہے۔ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

الجمعہ

نام آیت ۹ کے فقرے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اس سورہ میں نماز جمعہ کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، لیکن "جمعہ" بحیثیت مجموعی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ دوسری سورتوں کے ناموں کی طرح یہ نام بھی علامت ہی کے طور پر ہے۔

زمانۂ نزول پہلے رکوع کا زمانۂ نزول ۷ھ ہے، اور غالباً یہ فتح خیبر کے موقع پر یا اس کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم حضورؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جب یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح خیبر سے پہلے ایمان لائے تھے۔ اور خیبر کی فتح ابن ہشام کے بقول محرم، اور ابن سعد کے بقول جمادی الاولیٰ ۷ھ میں ہوئی ہے۔ پس قرین قیاس یہ ہے کہ یہودیوں کے اس آخری گڑھ کو فتح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائی ہونگی، یا پھر ان کا نزول اس وقت ہوا ہوگا جب خیبر کا انجام دیکھ کر شمالی حجاز کی تمام یہودی بستیاں اسلامی حکومت کی تابع فرمان بن گئی تھیں۔

دوسرا رکوع ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے مدینۂ طیبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، اور اس رکوع کی آخری آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اقامت جمعہ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد لازماً کسی

ایسے زمانے ہی میں پیش آیا ہو گا جب لوگوں کو دینی اجتماعات کے آداب کی پوری تربیت ابھی نہیں ملی تھی۔

موضوع اور مضامین جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اس سُورہ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی لیے دونوں کے موضوع الگ ہیں اور مخاطب بھی الگ۔ اگرچہ ان کے درمیان ایک نوع کی مناسبت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک سُورہ میں جمع کیا گیا ہے، لیکن مناسبت سمجھنے سے پہلے ہمیں دونوں کے موضوعات کو الگ الگ سمجھ لینا چاہیے۔

پہلا رکوع اُس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے پچھلے چھ سال کے دوران میں انہوں نے کی تھیں۔ پہلے مدینہ میں ان کے تین تین طاقتور قبیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پُوری طرح تباہ ہو گیا اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے، مگر غزوۂ احزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڑھ خیبر رہ گیا تھا جہاں مدینہ سے نکلے ہوئے یہودیوں کی بھی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ اِن آیات کے نزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہو گیا، اور یہودیوں نے خود درخواست کر کے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیا۔ اِس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اُسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار، جس کا نام سننا تک انہیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اس سُورہ میں ایک مرتبہ پھر ان کو خطاب فرمایا، اور غالباً یہ آخری خطاب تھا جو قرآن مجید میں ان سے کیا گیا۔ اِس میں انہیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

(۱) تم نے اِس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اُس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم

حقارت کے ساتھ "اُمّی" کہتے ہو۔ تمہارا زعم باطل یہ تھا کہ رسُول لازماً تمہاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمہاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے، کیونکہ یہ منصب تمہاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور "امیوں" میں کبھی کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن اللہ نے انہی اُمّیوں میں سے ایک رسول اٹھایا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اُس کی کتاب سُنا رہا ہے، نفوس کا تزکیہ کر رہا ہے، اور ان لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔ اُس کے فضل پر تمہارا اجارہ نہیں ہے کہ جسے تم دلوانا چاہو اسی کو وہ دے اور جسے تم محروم رکھنا چاہو اسے وہ محروم رکھے۔

(۲) تم کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمّہ داری نہ سمجھی، نہ ادا کی۔ تمہارا حال اُس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کس چیز کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔ بلکہ تمہاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا، مگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور اس پر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔ گویا تمہاری رائے یہ ہے کہ خواہ تم اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو، بہر حال اللہ اس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمہارے سوا کسی کو نہ بنائے!

(۳) تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمہیں اگر یقین ہوتا کہ اس کے ہاں تمہارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمہیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو۔ تمہاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو، اور تمہارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں

کے سامنے مرے تو اللہ کے ہاں اُس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔

یہ ہے پہلے رکوع کا مضمون۔ اس کے بعد دوسرا رکوع، جو کئی سال پہلے نازل ہُوا تھا، اس سورہ میں لا کر اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سَبْت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جمعہ عطا فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبّہ فرمانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا۔ یہ رکوع اُس وقت نازل ہُوا تھا جب مدینے میں ایک روز عین نماز جمعہ کے وقت ایک تجارتی قافلہ آیا اور اس کے ڈھول تاشوں کی آواز سُن کر ۱۲ آدمیوں کے سوا تمام حاضرین مسجد نبوی سے قافلے کی طرف دوڑ گئے، حالانکہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس پر یہ حکم دیا گیا کہ جمعہ کی اذان ہونے کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت اور ہر دوسری مصروفیت حرام ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اُس وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑیں۔ البتہ جب نماز ختم ہو جائے تو انہیں حق ہے کہ اپنے کاروبار چلانے کے لیے زمین میں پھیل جائیں۔ احکامِ جمعہ کے بارے میں یہ رکوع ایک مستقل سورۃ بھی بنایا جا سکتا تھا، اور کسی دوسری سُورۃ میں بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے خاص طور پر اسے یہاں اُن آیات کے ساتھ لا کر ملا گیا جن میں یہودیوں کو اُن کے انجامِ بد کے اسباب پر متنبّہ کیا گیا ہے۔ اس کی حکمت ہمارے نزدیک وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ــ بادشاہ ہے، قُدوس ہے، زبردست اور حکیم ہے[1]

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حدید، حواشی ۱، و ۲ ۔ الحشر، حواشی ۳۶ و ۳۷، ۴۱۔ آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔ عرب کے یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات اور کارناموں میں رسالت کی صریح نشانیاں بچشمِ سر دیکھ لینے کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کے آنے کی صریح بشارت دی تھی جو آپ کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہوتی تھی، صرف اِس بنا پر آپ کا انکار کر رہے تھے کہ اپنی قوم اور نسل سے باہر کے کسی شخص کی رسالت مان لینا انہیں سخت ناگوار تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے ہم صرف اسی کو مانیں گے۔ دوسری کسی تعلیم کو، جو کسی غیر اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئے، خواہ وہ خدا ہی کی طرف سے ہو، تسلیم کرنے کے لیے وہ قطعی تیار نہ تھے۔ آگے کی آیتوں میں اسی رویّہ پر انہیں ملامت کی جا رہی ہے، اس لیے کلام کا آغاز اس تمہیدی فقرے سے کیا گیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی یہ پوری کائنات اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ اُن تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جن کی بنا پر یہودیوں نے اپنی نسلی برتری کا تصور قائم کر رکھا ہے۔ وہ کسی کا رشتہ دار نہیں ہے۔ جانب داری (FAVOURITISM) کا اس کے ہاں کوئی کام نہیں۔ اپنی ساری مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ یکساں عدل اور رحمت اور ربوبیت کا ہے۔ کوئی خاص نسل اور قوم اس کی چہیتی نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ کرے، بہر حال اس کی نوازشیں اسی کے لیے مخصوص رہیں، اور کسی دوسری نسل یا قوم سے اس کو عداوت نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتی ہو تو وہ اس کی عنایات سے محروم رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ بادشاہ ہے، یعنی دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔ تم بندے اور رعیت ہو۔ تمہارا یہ منصب کب سے ہو گیا کہ تم یہ طے کرو کہ وہ تمہاری ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر کسے بنائے اور کسے نہ بنائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ قدوس ہے، یعنی اس سے بدرجہا منزہ اور پاک ہے کہ اُس کے فیصلے میں کسی خطا اور غلطی کا امکان ہو۔ غلطی تمہاری سمجھ بوجھ میں ہو سکتی ہے۔ اُس کے فیصلے میں نہیں ہو سکتی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو مزید صفتیں بیان فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ زبردست

وُہی ہے جس نے اُمیّوںؔ کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اٹھایا، جو اُنہیں اُس کی آیات سُناتا ہے،

ہے، یعنی اس سے لڑ کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو کچھ کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے، اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دُنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کر سکتا۔

؎ یہاں اُمّی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا ہے، اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو یہودی حقارت کے ساتھ اُمّی کہتے ہیں اور اپنے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں، اُنہی میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اٹھایا ہے۔ وہ خود نہیں اُٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس کا اٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے، جس کی قوت سے لڑ کر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں "اُمّی" کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہلِ کتاب کے مقابلہ میں اُن لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا: قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ (آل عمران - ۲۰) "اہلِ کتاب اور اُمیوں سے پوچھو کیا تم نے اسلام قبول کیا؟" یہاں اُمیوں سے مراد مشرکینِ عرب ہیں، اور ان کو اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہلِ کتاب کے اَن پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ (البقرہ - ۷۸) "اِن یہودیوں میں کچھ لوگ اُمّی ہیں، کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے، بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں۔" اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔ مثلاً فرمایا: ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (آل عمران - ۷۵) یعنی "ان کے اندر یہ بددیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اُمیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔" یہی تیسرے معنی ہیں جو آیت زیرِ بحث میں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان کے لفظ گوئیم کا ہم معنی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی بائیبل میں GENTILES کیا گیا ہے، اور اس سے مراد تمام غیر یہودی یا غیر اسرائیلی لوگ ہیں۔

لیکن اس یہودی اصطلاح کی اصل معنویت محض اس کی اس تشریح سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دراصل عبرانی

اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۱۱]، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھُلی گمراہی

زبان کا لفظ گوئیم ابتداءً محض اقوام کے معنی میں بولا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اُسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کے لیے مخصوص کر دیا، پھر اس کے اندر یہ معنی پیدا کر دیے کہ یہودیوں کے سوا باقی تمام اقوام ناشائستہ، بدمذہب ناپاک اور ذلیل ہیں، حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح BARBARIAN سے بھی بازی لے گیا جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ربّیوں کے لٹریچر میں گوئیم اس قدر قابلِ نفرت لوگ ہیں کہ ان کو انسانی بھائی نہیں سمجھا جا سکتا، ان کے ساتھ سفر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر ان میں سے کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنے والا مسیح تمام گوئیم کو ہلاک کر دے گا اور جلا کر خاکستر کر ڈالے گا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، آل عمران، حاشیہ ۶۴)

۱۱؎ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں، اور ہر جگہ ان کے بیان کی غرض مختلف ہے۔ البقرہ آیت ۱۲۹ میں ان کا ذکر اہلِ عرب کو یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ آنحضورؐ کی بعثت جسے وہ اپنے لیے زحمت و مصیبت سمجھ رہے تھے، درحقیقت ایک بڑی نعمت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اپنی اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ البقرہ آیت ۱۵۱ میں انہیں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان حضورؐ کی قدر پہچانیں اور اس نعمت سے پورا پورا فیض حاصل کریں جو حضورؐ کی بعثت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ آلِ عمران آیت ۱۶۴ میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے اِن کا اعادہ کیا گیا ہے کہ وہ کتنا بڑا احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے درمیان اپنا رسول بھیج کر کیا ہے اور یہ لوگ کتنے نادان ہیں کہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اب چوتھی مرتبہ انہیں اِس سورہ میں دُہرایا گیا ہے جس سے مقصود یہودیوں کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری آنکھوں کے سامنے جو کام کر رہے ہیں وہ صریحاً ایک رسول کا کام ہے۔ وہ اللہ کی آیات سنا رہے ہیں جن کی زبان، مضامین، اندازِ بیان، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ فی الواقع وہ اللہ ہی کی آیات ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، اُن کے اخلاق اور عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں، اور ان کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پھر وہ صرف آیات ہی سنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر وقت

میں پڑے ہوئے تھے[۴]۔ اور (اس رسول کی بعثت) اُن دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں[۵]۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے[۶]۔ یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا

اپنے قول اور عمل سے اور اپنی زندگی کے نمونے سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کا منشا سمجھا رہے ہیں اور ان کو اُس حکمت و دانائی کی تعلیم دے رہے ہیں جو انبیاء کے سوا آج تک کسی نے نہیں دی ہے۔ یہی سیرت اور کردار اور کام ہی تو انبیاء کا وہ نمایاں وصف ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ جس کا رسول برحق ہونا اس کے کارناموں سے علانیہ ثابت ہو رہا ہے اس کو ماننے سے تم نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اللہ نے اسے تمہاری قوم کے بجائے اُس قوم میں سے اٹھایا جسے تم اُمّی کہتے ہو۔

[۴] یہ حضورؐ کی رسالت کا ایک اور ثبوت ہے جو یہودیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے عرب کی سرزمین میں آباد تھے اور اہلِ عرب کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اور تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ اُن کی اس سابق حالت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ چند سال کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و رہنمائی میں اِس قوم کی جیسی کایا پلٹ گئی ہے اُس کے تم عینی شاہد ہو۔ تمہارے سامنے وہ حالت بھی ہے جس میں یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے مبتلا تھے۔ وہ حالت بھی ہے جو اسلام لانے کے بعد ان کی ہو گئی، اور اِسی قوم کے اُن لوگوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے۔ کیا یہ کھلا کھلا فرق جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کے سوا کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا؟ بلکہ اس کے سامنے تو پچھلے انبیاء تک کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔

[۵] یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف عرب قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی اُن دوسری قوموں اور نسلوں کے لیے بھی ہے جو ابھی آکر اہلِ ایمان میں شامل نہیں ہوئی ہیں مگر آگے قیامت تک آنے والی ہیں۔ اصل الفاظ ہیں وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ "دوسرے لوگ اُن میں سے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں"۔ اس میں لفظ منہم ان میں سے، کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دوسرے لوگ اُمیّوں میں سے، یعنی دنیا کی غیر اسرائیلی قوموں میں سے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے ہوں گے جو ابھی اہلِ ایمان میں شامل نہیں ہوئے ہیں مگر بعد میں آکر شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح یہ آیت منجملہ ان آیات کے ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ رسول اللہ

فضل فرمانے والا ہے۔

جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا،[۸] اُن کی مثال اُس گدھے کی سی

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہے اور ابد تک کے لیے ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات جہاں اس مضمون کی صراحت کی گئی ہے، حسبِ ذیل ہیں: الانعام، آیت ۱۹۔ الاعراف، ۱۵۸۔ الانبیاء، ۱۰۷۔ الفرقان، ۱۔ سبا، ۲۸۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۴۷)۔

[۶] یعنی یہ اُسی کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایسی ناتراشیدہ اُمّی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبی پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر ابدی اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوعِ انسانی مل کر ایک اُمّت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی پسماندہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہین سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مکمل طور پر کایا پلٹ دے، اور پھر ایسے جامع اصول دنیا کو دے دے جن پر ساری نوعِ انسانی ایک اُمّت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر و ہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس پر اگر کسی بے وقوف کا دل دکھتا ہے تو دکھتا رہے۔

[۷] اس فقرے کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ اس کا حق ادا کیا۔ خاص معنی یہ ہیں کہ حاملِ توراۃ گروہ ہونے کی حیثیت سے جن کا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس رسول کا ساتھ دیتے جس کے آنے کی صاف صاف بشارت توراۃ میں دی گئی تھی، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور توراۃ کی تعلیم کے تقاضے کو پورا نہ کیا۔

[۸] یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔

ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اِس سے بھی زیادہ بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جُھٹلا دیا ہے۹۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اِن سے کہو "اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو۱۰، اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس

۹ یعنی ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا اس لیے معذور ہے۔ مگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو توراۃ کی رُو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قصوروار نہیں ہیں بلکہ جان بُوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔

۱۰ یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ "اے یہودیو" نہیں کہا ہے بلکہ "اے وہ لوگو جو یہودی بن گئے ہو" یا "جنہوں نے یہودیت اختیار کر لی ہے" فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دین جو موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اِس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ اُن اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔ اس کے بعد صرف یہوداہ، اور اس کے ساتھ بن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے "یہود" ہی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربّیوں اور اَحبار نے اپنے اپنے خیالات و نظریات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسُولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے ۔ اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی "اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو" ان

تم ہی اللہ کے چہیتے ہو[۱۱] تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اِس زعم میں سچے ہو[۱۲]" لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے

میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے، بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں "اے بنی اسرائیل" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِیْنَ هَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

۱۱ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس دعوے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ یہودیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا (البقرہ۔ ۱۱۱)۔ ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی، اگر ہم کو سزا ملے گی بھی تو بس چند روز (البقرہ۔ ۸۰۔ آل عمران۔ ۲۴)۔ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں (المائدہ ۱۸)۔ ایسے ہی کچھ دعوے خود یہودیوں کی اپنی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ مخلوق (CHOSEN PEOPLE) کہتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے جو کسی دوسرے انسانی گروہ سے نہیں ہے۔

۱۲ یہ بات قرآن مجید میں دوسری مرتبہ یہودیوں کو خطاب کرکے کہی گئی ہے۔ پہلے سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا تھا "ان سے کہو، اگر آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے اللہ کے ہاں مخصوص ہے تو پھر تم موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے اُن کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ تم تمام انسانوں سے بڑھ کر، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر ان کو کسی نہ کسی طرح جینے کا حریص پاؤگے۔ ان میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس جیے، حالانکہ وہ لمبی عمر پائے تب بھی اسے یہ چیز عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ ان کے سارے کرتوت اللہ کی نظر میں ہیں" (آیات ۹۴۔۹۶)۔ اب اسی بات کو پھر یہاں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض تکرار نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ والی آیات میں یہ بات اُس وقت کہی گئی تھی جب یہودیوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی۔ اور اس سورۃ میں اس کا اعادہ اُس وقت کیا گیا ہے جب ان کے ساتھ متعدد معرکے پیش آنے کے بعد عرب میں آخری اور قطعی طور پر ان کا زور توڑ دیا گیا۔ ان معرکوں نے، اور ان کے اس انجام نے وہ بات تجربے اور مشاہدے سے ثابت کر دی جو پہلے کہی گئی تھی۔ مدینے اور خیبر میں یہودی طاقت بلحاظ تعداد مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھی، اور بلحاظ وسائل ان سے بہت زیادہ تھی۔ پھر عرب کے مشرکین اور مدینے کے منافقین

اپنے اُن کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں۔ اور اللہ اِن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اِن سے کہو، جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے، اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ع ع

بھی اُن کی پُشت پر تھے اور مسلمانوں کو مٹانے پر تُلے ہوئے تھے لیکن جس چیز نے اِس نامساوی مقابلے میں مسلمانوں کو غالب اور یہودیوں کو مغلوب کیا وہ یہ تھی کہ مسلمان راہِ خدا میں مرنے سے خائف تو درکنار، دل سے اس کے مشتاق تھے اور سر ہتھیلی پر لیے ہوتے میدانِ جنگ میں اُترتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ خدا کی راہ میں لڑ رہے ہیں، اور وہ اس بات پر بھی کامل یقین رکھتے تھے کہ اس راہ میں شہید ہونے والے کے لیے جنت ہے۔ اس کے برعکس یہودیوں کا حال یہ تھا کہ وہ کسی راہ میں بھی جان دینے کے لیے تیار نہ تھے، نہ خدا کی راہ میں، نہ قوم کی راہ میں، نہ خود اپنی جان اور مال اور عزت کی راہ میں۔ انہیں صرف زندگی درکار تھی، خواہ وہ کیسی ہی زندگی ہو۔ اسی چیز نے ان کو بزدل بنا دیا تھا۔

سلہ بالفاظِ دیگر ان کا موت سے یہ فرار بے سبب نہیں ہے۔ وہ زبان سے خواہ کیسے ہی لمبے چوڑے دعوے کریں، مگر ان کے ضمیر خوب جانتے ہیں کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہے، اور آخرت میں اُن حرکتوں کے کیا نتائج نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے جو وہ دنیا میں کر رہے ہیں۔ اسی لیے ان کا نفس خدا کی عدالت کا سامنا کرنے سے جی چُراتا ہے۔

اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار

(۳)

ڈاکٹر ابراہیم الشریقی
ترجمہ: خلیل حامدی

مسئلہ فلسطین سلامتی کونسل میں سلامتی کونسل کے اجلاس سے تھوڑی دیر پہلے امریکی حکومت نے ایک خفیہ اجلاس میں جو ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو وہائٹ ہاؤس (واشنگٹن) میں منعقد ہوا تھا، تقسیم فلسطین کی قرارداد سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور طے کیا کہ فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز زیر بحث لائی جائے۔ امریکی حکومت نے اپنے نمائندے مسٹر آسٹن کو ہدایت کی کہ وہ اس تجویز کو سرکاری طور پر کسی موزوں اجلاس میں پیش کرے۔ امریکی نمائندے نے جب یہ تجویز سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تو روس کے نمائندے نے اس پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور کونسل سے اس تجویز کو مسترد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ عرب نمائندوں نے بعض تحفظات کے ساتھ بین الاقوامی تولیت کی تجویز کی تائید کی۔ فرانس کے نمائندے نے کہا:

> "میں اپنی حکومت کی طرف سے امریکی تجویز کی حمایت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ تقسیم کا نظریہ جیسا کہ مسٹر آسٹن نے اپنے بیان میں واضح کیا ہے، انتہائی غلط ہے اور فلسطین کے پیچیدہ مسئلہ کو ہرگز حل نہیں کر سکتا۔"

مگر روس کا نمائندہ گرومیکو اس امریکی تجویز پر برس پڑا۔ اس نے کہا:

> "نئی تجویزوں اور حلوں کی تلاش میں تضییع اوقات سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ تقسیم ہی قابلِ قبول حل ہے۔ یہی حل یہودی قوم کو جو ماری ماری پھرتی ہے اور طرح طرح کے مصائب میں گھری ہوئی ہے استقرار بخش سکتا ہے اور فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ سلامتی

کونسل کو کسی ایسی قرارداد کے اندر ترمیم یا تبدیل کا کوئی حق نہیں ہے جسے جنرل اسمبلی منظور کر چکی ہو۔ امریکہ نے جو نئی تجویز پیش کی ہے یعنی تقسیم کے بجائے فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز، اس سے اُس کا مقصد صرف عربوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تاکہ امریکہ اپنے تیل کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔[1]

غرض جس روز سے مسئلۂ فلسطین اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش ہوا اُس دن سے لے کر اسرائیل کے قیام اور قیام کے بعد کے عرصہ تک ہر مرحلہ میں روس اور کمیونسٹ بلاک لگاتار عربوں کی کھلم کھلا اور تند و تیز مخالفت کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اشتراکی ممالک کا شدید تر اور تلخ تر حملہ وہ تھا جو ۱۹۴۸ء میں انہوں نے کیا تھا۔ سلامتی کونسل میں فلسطین کے حقِ خود ارادیت پر ایک فیصلہ کن معرکہ برپا تھا کہ روس نے بالآخر دخل اندازی کرتے ہوئے یہاں تک دھمکی دے دی کہ روس اسرائیل کی حفاظت اور امن کے تحفظ کی خاطر طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اس وقت فلسطینی قوم کی مدد کے لیے عرب ممالک کے متعدد دستے فلسطین میں داخل ہو رہے تھے۔ روسی مندوب نے ان دستوں کو بیرونی دخل اندازی قرار دیا۔ اس سلسلے میں اُس نے سلامتی کونسل کے اندر جو تقریر کی اُس کا ملخص یہ تھا:

"سلامتی کونسل کو چاہیے کہ وہ فوراً بلا تاخیر عرب گوریلوں کو حکم دے کہ وہ فلسطین سے نکل جائیں۔ جب تک سرزمینِ فلسطین سے عرب گوریلے، جنہوں نے فلسطین پر لشکر کشی کر کے جنگ کی آگ بھڑکا رکھی ہے، واپس نہیں نکل جاتے اُس وقت تک قیامِ امن کے لیے جنگ بندی کا کوئی فائدہ نہیں ہے . . .

. . . یہودی قوم کی امداد اور فلسطین کے اندر اُس کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہم تمام ذرائع استعمال کریں گے۔"

۲۵ مئی ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں، جو اسرائیل کے قیام کے اعلان اور فلسطین کی واگزاری کے لیے عرب افواج کے داخلے کے دوسرے ہی روز منعقد ہوا، شامی وفد کے قائد فارس بک الخوری نے ایک نہایت پُرمغز تاریخی بیان دیا اور سلامتی کونسل کے سامنے حق اور انصاف کو اُجاگر کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی۔ مگر سلامتی کونسل کی فضا کذب گوئی،

---

[1] ملاحظہ ہو سلامتی کونسل کی کارروائی ۵ و ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء

افترا پردازی، دھوکہ اور سیاسی چالبازیوں سے پُوری طرح مسموم تھی۔ علامہ فارس الخوری نے اس سب کے باوجود ببانگِ دُہل کہا:

"فلسطین کی سرزمین میں یہودیوں کی ایک جماعت استعمار کی پشت پناہی اور صہیونیت کی ریشہ دوانی سے داخل ہوئی۔ اُس نے سازشوں کے ذریعہ سے اور بین الاقوامی چالبازیوں کے پردہ میں عرب قوم کو چیلنج کر دیا اور بزورِ طاقت قدم جمانا شروع کر دیئے۔ اس ظالمانہ چیلنج کے جواب میں عرب حکومتوں نے فلسطینی قوم کی آواز پر لبیک کہا اور اُس کی دستگیری اور حق رسی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔"

اسرائیل کو تسلیم کرنے میں مسابقت قراردادِ تقسیم کے ہیروؤں نے صرف اقوامِ متحدہ سے یہ ظالمانہ قرارداد منوانے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اسے بزورِ طاقت نافذ کرنے کے لیے صہیونیوں کی پُوری پوری مدد کی۔ اور بالآخر جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان ہُوا تو اس کے دس منٹ بعد تل ابیب پر اس ریاست کو تسلیم کر لینے کے برقیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ سب سے پہلا برقیہ جس میں اسرائیل کو تسلیم کیا گیا امریکہ کے صدر ٹرومین کا تھا۔ اس کے چار منٹ بعد اسٹالن کا برقیہ پہنچ گیا۔ اور پھر کمیونسٹ ممالک اور مغربی یورپ کے ممالک کے برقیے پہنچے۔ مغربی یورپ کے برقیوں میں سب سے پہلا برطانیہ کا برقیہ تھا۔ اسٹالن کا برقیہ جو اس وقت ماسکو ریڈیو نے نشر کیا تھا اور یورپ اور امریکہ کے اخبارات میں بھی چھپا اس لحاظ سے ممتاز اور منفرد برقیہ تھا کہ اس میں بڑے پُرکشش اور ہمدردانہ اور حوصلہ افزا الفاظ میں اسرائیل کے فروغ کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

امریکہ اور رُوس دونوں اسرائیل کے بانی ہیں اس تاریخ سے یہ بات بالکل ناقابلِ انکار حد تک واضح ہے کہ بین الاقوامی طاقتوں نے مل کر اسرائیل کو جنم دیا ہے، اور مغربی بلاک اور مشرقی بلاک (بزیرِ قیادتِ روس) دونوں نے اس میں ملی بھگت کا ثبوت دیا ہے۔ رُوس نے دراصل "دولتِ یہود" کے تصوّر کو اشتراکی بنیادوں پر جامۂ عمل پہنانے کی سعی کی اور اس معاملے میں اس کے پیشِ نظر اسی منصوبہ پر عملدرآمد کرنا تھا جو اشتراکی تحریک کے یہودی زعماء نے وضع کیا تھا۔ یہی وہ زعماء تھے جنہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں خود رُوس کے بالشویک انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسرائیل کے بارے میں بلاشبہ اس حد تک روس کا منصوبہ ضرور کامیاب ہو گیا کہ ایک یہودی ریاست وجود میں آ گئی۔ مگر روس کی یہ کوشش سعیٔ ناکام ثابت ہوئی کہ یہ ریاست خالصتاً کمیونسٹ ریاست بن جائے۔

اس کی وجہ زعمائے صہیون کی یہ اسکیم ہے کہ صہیونیت کو بیک وقت کمیونزم اور مغربی سرمایہ داری، دونوں سے رشتہ برقرار رکھنا ہے اور دونوں سے اپنے مقاصد کی خدمت لینی ہے۔

اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے دوستانہ معاہدے | اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی یہودی ریاست قائم ہو جانے کے بعد اشتراکی ممالک نے اسے پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ مشرقی کیمپ اور خاص طور پر سوویت یونین، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ نے اسرائیل کے ساتھ اقتصادی، ثقافتی اور فنی تعلقات کو قائم کرنے اور بڑھانے میں مغربی کیمپ سے ہمیشہ سبقت کی ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے سب سے پہلا معاہدہ جو کسی بیرونی ملک کے ساتھ کیا وہ وہ معاہدہ تھا جو اسٹالن کے عہد میں سوویت یونین کے ساتھ کیا گیا۔ اس ابتدائی معاہدے کے بعد خروشیف کے دور میں پے در پے تجارتی، ثقافتی اور سیاحتی معاہدات استوار کیے گئے۔ ان سب پر مستزاد وہ معاہدہ ہے جو بحری تجارت کے میدان میں اسرائیل سے کیا گیا ہے اور جس کی رُو سے رُوس کے تجارتی جہاز اسرائیلی بندرگاہوں کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اسرائیل بالفعل روسی جہازوں کے ذریعہ سے ہی ایشیا کی منڈیوں اور مشرقی یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اپنی برآمدات منتقل کر رہا ہے۔ صرف ۱۹۶۴ء میں اسرائیل اور روس کے درمیان تین معاہدات قائم ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تجارتی معاہدہ: اس معاہدے کی رُو سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی اشیاء کے تبادلہ کو ترقی دی جائے گی۔ رُوس اسرائیل سے فاسفیٹ، کیمیاوی اشیا اور پارچات خریدے گا۔ اور اسرائیل روس سے انجن، بجلی کے آلات اور ریشم درآمد کرے گا تاکہ اپنے کارخانوں میں تیار کر کے اُسے یہودیوں کی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ مغربی یورپ اور امریکہ میں فروخت کرے۔

۲۔ سیاحت کا معاہدہ: دونوں ملکوں کے درمیان سیاحت کو ترقی دی جائے گی اور اس میدان میں ہر طرح کی سہولتیں بخشش از بخشش فراہم کی جائیں گی۔ روسی مزدوروں اور اسرائیلی مزدوروں کے مابین روابط کو نشوونما دیا جائے گا۔ دونوں ملکوں میں فنکاروں، سائنس دانوں اور مصنفین کے باہمی تبادلہ اور دوروں کے لیے سالانہ پروگرام وضع کیے جائیں گے۔ چنانچہ اسی معاہدہ کی رُو سے ۱۹۶۴ء میں ہزاروں روسی سیاح

اسرائیل میں داخل ہوئے ہیں اور اُدھر یہودی نوجوانوں اور عمّال کے متعدد وفود سوویت یونین کا دورہ کر چکے ہیں۔

۳۔ **بحری نقل و حرکت کا معاہدہ:** دونوں ملکوں کے درمیان مشترک بحری تجارت کی درآمد و برآمد میں پوری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اسرائیل کے تجارتی جہازوں کو اجازت ہوگی کہ وہ سامانِ تجارت کو لادنے اور اتارنے اور ایندھن حاصل کرنے کے لیے روسی بندرگاہوں کو استعمال کریں۔ اس کے بالمقابل روس کا تجارتی بیڑہ اسرائیلی بندرگاہوں کے استعمال کا مجاز ہوگا۔

اسرائیل اور روس کے مابین جتنے معاہدات ہوئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے اشتراکی ممالک نے بھی ۱۵ سالوں کے اندر اسرائیل کے ساتھ متعدد معاہدات استوار کیے ہیں۔ ان ملکوں کے ساتھ اسرائیل کے معاہدات کا اجمالی بیان یہ ہے:

یوگوسلاویہ کے ساتھ	۴ معاہدات	ابھی تک قائم اور جاری ہیں
چیکوسلواکیہ کے ساتھ	۵ ″	″ ″
رومانیہ کے ساتھ	۴ ″	″ ″
بلغاریہ کے ساتھ	۳ ″	″ ″
پولینڈ کے ساتھ	۳ ″	″ ″
ہنگری کے ساتھ	۳ ″	″ ″

اشتراکی ممالک اسرائیل کی منڈی ہیں اشتراکی ممالک کی ہر گونہ مدد کی بدولت، جس میں اسرائیلی مصنوعات کے لیے منڈیاں مہیا کرنا اور اسرائیل کو ہر نوعیت کے میکانکی آلات فراہم کرنا بھی شامل ہے، اسرائیل نے قلیل مدت میں ترقی کے کئی مراحل طے کر لیے اور اس کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ اسرائیل اپنی فاضل زرعی پیداوار (پھل اور غلہ) کا ۶۰ فیصد، کیمیاوی اشیاء کا ۴۰ فیصدی اور مختلف مصنوعات کا ۵۰ فیصد مشرقی یورپ کے ممالک اور روس کو برآمد کرتا ہے۔ ان ممالک میں یوگوسلاویہ پیش پیش ہے جس نے اسرائیل کے ساتھ پچھلے چند سالوں میں تجارتی تعلقات کو بڑی وسعت دی ہے یعنی ۱۹۶۵ء تک اُس کے تعلقات کی جو نسبت تھی اُس کے بعد یہ نسبت تین گنی بڑھ گئی۔

جو بات خاص طور پر توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل اشتراکی بلاک سے جو اشیاء درآمد کرتا ہے اُن کا بڑا حصہ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کو برآمد کر دیتا ہے۔ اسرائیل کی اپنی مصنوعات کا بھی یہ حال ہے کہ جو افریقی ممالک اسرائیل کے ساتھ تجارتی اور فنی معاہدوں میں منسلک ہیں ان کی منڈیوں میں اسرائیلی مصنوعات کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور قریب قریب اسرائیلی مصنوعات نے منڈیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اسرائیل کی صنعتی اور زرعی ترقی میں کمیونسٹ ممالک کا حصہ | صنعتی اور زراعتی پہلوؤں کو لیجیے۔ ایوان ہائے تجارت کے اعلامیوں اور بین الاقوامی صنعت کے اعداد و شمار، اور یورپ اور اسرائیل کے سرکاری مآخذ اور بین الاقوامی عالمی تجارت کی گائیڈ بکس کو دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسرائیل میں جتنے کارخانے قائم کیے گئے ہیں، اور اسرائیلی ماہرین زراعت کے میدان میں جتنی مشینری استعمال کر رہے ہیں اس کا بڑا حصہ کمیونسٹ بلاک سے اسرائیل نے درآمد کیا ہے اور کچھ مغربی یورپ اور امریکہ سے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اعداد و شمار:

سنہ ۱۹۵۰ء تا سنہ ۱۹۶۵ء	کل تعداد	کمیونسٹ بلاک سے درآمد کردہ	مغربی بلاک سے درآمد کردہ
شکر سازی کے کارخانے	۳	۲	۱
دودھ اور پنیر تیار کرنے کی فیکٹریاں	۱۲۵	۹۰	۳۵
رس نکالنے کی فیکٹریاں	۱۴	۸	۶
بیجوں کے تیل اور پھل صاف کرنے کے کارخانے	۱۰	۶	۴
فلور ملز	۵۰	۳۰	۲۰
پارچہ بافی کی ملیں	۹	۵	۴
جوتے بنانے کی فیکٹریاں	۲۶	۹	۱۷
کیمیاوی کھاد کی فیکٹریاں	۲	۱	۱
مختلف کیمیاوی اشیاء کے کارخانے	۷	۳	۴
دواسازی کے کارخانے	۵	۲	۳
بجلی کا سامان تیار کرنے والی فیکٹریاں	۸	۳	۵

پاور ہاؤس	۷۰۰	۵۰۰	۲۰۰
لکڑی کے کام کی ورکشاپیں	۵۰	۳۵	۱۵
سیمنٹ کی فیکٹریاں	۴	۳	۱
گلاس فیکٹریاں	۳	۲	۱
پٹرول صاف کرنے کے کارخانے	۲		۲
زرعی ٹریکٹر وغیرہ	۲۰۰۰	۱۵۰۰	۵۰۰
غلہ کاٹنے اور گاہنے کی مشینیں	۳۰۰۰	۲۰۰۰	۱۰۰۰

ان اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیل کی صنعتی ترقی کا دار و مدار امریکہ اور مغربی یورپ کی بافراط امداد کے علاوہ روس اور وارسا پیکٹ سے وابستہ کمیونسٹ ممالک پر ہے۔ یہ بات بھی خلافِ حقیقت نہیں ہے کہ اسرائیل نے مغربی کیمپ سے خوب خوب فوائد حاصل کیے ہیں۔ خاص طور پر امریکہ ہر سال مشرقِ اوسط اور افریقی ممالک اور ایشیا کی بعض پسماندہ ریاستوں کو جو امداد بھیجتا ہے اسرائیل بھی اس سے خاطر خواہ حصہ لیتا ہے۔ اسرائیل کے اکثر و بیشتر آبی منصوبے جنہیں وہ مکمل کر چکا ہے، پختہ شاہراہیں، زرعی اصلاحات اور معدنی دولت کی تلاش و تحقیق (جسے وہ دریافت کر چکا ہے اور اس سے استفادہ کر رہا ہے) ان تمام مدوں کو اس نے امریکی امداد اور امریکہ اور یورپ کی یہودی کمپنیوں اور تنظیموں کے عطیات سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

اسرائیل اور سوشلزم | یہ کوئی نیا راز نہیں ہے کہ اسرائیل جب سے وجود میں آیا ہے اس کی زمامِ اقتدار سوشلسٹ لیبر پارٹی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہ پارٹی "مابی" کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسے ان یہودی عناصر نے تشکیل کیا ہے جو مشرقی یورپ کی اشتراکی تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس پارٹی کا موجودہ سربراہ لیوی اشکول ہے جو اس وقت اسرائیل کا وزیر اعظم ہے۔ اس پارٹی کا بنیادی ستون وہاں کی لیبر فیڈریشن (ہستدروت) ہے جس میں اسرائیلی مزدوروں کی مجموعی تعداد کا ۶۵ اور ۷۰ فیصد حصہ شامل ہے۔ بائیں بازو کی ایک اور سوشلسٹ پارٹی بھی ہے جسے "احدوث ھاودا" کہا جاتا ہے، جو لیبر یونینوں کے کچھ گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک نئی پارٹی وجود میں آئی ہے جو دراصل مابی پارٹی سے الگ ہو جانے والے عنصر نے تشکیل کی ہے، اس کا نام "رافی" ہے اور اس کی قیادت بن گوریان کے

ہاتھ میں ہے۔ سب سے خطرناک پارٹی "حیروت" ہے جو بائیں بازو کے انتہا پسند گروہوں کی نمائندہ ہے۔ دوسرے درجہ پر یسر پارٹی اغودات ہے اور تیسرے درجہ پر "حزب مزراحی"۔ ان تمام پارٹیوں کے قائدین اور مشرقی کیمپ کی حکمران کمیونسٹ پارٹیوں کے رہنماؤں کے درمیان متعدد وطنی، نسلی، فکری اور مشترکہ مفادات کے رشتے پائے جاتے ہیں۔ دراصل اسرائیل ایک سوشلسٹ اسٹیٹ ہے۔ اسرائیل کے حکمران وہ لوگ ہیں جو یورپ کے اشتراکی ممالک سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہوتے ہیں۔ اسرائیل کا طویل المیعاد منصوبہ جسے وہ کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا اس ریاست کی حدود کو فرات سے نیل تک وسیع کرنا ہے۔

اسرائیل کے مہاجرین میں کمیونسٹ ممالک کا تناسب ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اسرائیل کی آبادی کی اکثریت اشتراکی ممالک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اور ۲۵ لاکھ کی آبادی میں ان لوگوں کا تناسب یہ ہے:

۱,۵۰۶,۰۰۰	روس اور مشرقی یورپ کے علاقوں سے آنے والے
۲۵۰,۰۰۰	ایشیائی اور افریقی ممالک سے آنے والے
۲۰۰,۰۰۰	مغربی یورپ کے مہاجرین
۷۰,۰۰۰	شمالی اور لاطینی امریکہ کے مہاجرین
۲۲۰,۰۰۰	عرب ممالک کے یہودی

ماسکو اسرائیل کے بقا کا حریص ہے ہم علانیہ کہتے ہیں کہ روس نے اسرائیل کے بارے میں جو موقف اختیار کر رکھا ہے وہ سیاسی نقشے کے لحاظ سے اس رویّے سے ہرگز مختلف نہیں ہے جس کا امریکہ نے مظاہرہ کیا ہے۔ دونوں اسرائیل کے وجود کو قائم رکھنے کے حریص ہیں۔ دونوں نے مل کر اُس کی صنعتی ترقی میں حصہ لیا ہے اور سرزمین عرب پر اُس کے پاؤں جمانے کی کوشش کی ہے۔ روس اور اشتراکی بلاک اسرائیل کے بقاء دوام کا کیوں شدت سے حریص ہے، اس کے تین بنیادی اسباب ہیں:

اوّلاً: اسرائیل اشتراکی بنیادوں پر قائم ہوا ہے اور اس کی اکثر آبادی اشتراکی ممالک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

ثانیاً: اسرائیل کا وجود اُن عربوں کو، جو اشتراکیت کے ہوا خواہ ہیں، مجبور کرتا رہے گا کہ وہ مشرقی بلاک کی حکومتوں سے تعاون کرتے رہیں اور اس کی تجارتی منڈیوں سے وابستہ رہیں۔

ثالثاً: دوسرے مادّی، سیاسی اور نظریاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے۔

عربوں سے روس کی دوستی کی اصل بنیاد اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اشتراکی ممالک کلاسیک سامراج کی مخالفت کرتے ہیں اور براہِ راست یا بالواسطہ ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے اس کے خلاف معرکہ آرا ہیں۔ اسی پُرفریب پالیسی نے بعض عربوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ اشتراکی ممالک اُن کے حامی ہیں اور صہیونیوں کے چنگل سے فلسطین کی واگذاری میں اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ مگر ۱۹۵۶ء کے حالات و واقعات اور اب جون ۱۹۶۷ء کے واقعات نے یہ مُبرہَن کر دیا ہے کہ مشرقی کیمپ نے ماسکو کی زبردست اشتراکیت نواز عرب ریاستوں سے جتنے رشتے بھی قائم کیے ہیں وہ اس بنیاد پر نہیں کیے ہیں کہ اسرائیل کے وجود کو محو کر دیا جائے گا، بلکہ خالص مصلحت پرستی کے نقطۂ نظر سے قائم کیے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اشتراکی انقلاب کی دعوت کی اشاعت کی جائے، اور عرب دنیا میں سستے طریقے سے اشتراکی فلسفہ و نظام کی جڑیں مضبوط کی جائیں اور اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے عرب ممالک کی منڈیوں سے استفادہ کیا جاتے۔ خود روسی لیڈر بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ عربوں کو جو کچھ امداد دے رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ اسرائیل کو منہدم کیا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ عرب دنیا میں اشتراکی رجحان کو مضبوط کیا جائے اور عربوں اور اسرائیل کے مابین پُرامن تعاون باہم کی فضا پیدا کی جائے یعنی عرب فلسطین پر یہودی قبضے کو تسلیم کریں اور آئندہ ان میں لڑائی نہ ہو۔

اشتراکی کیمپ کی طرف سے عربوں کی امداد کی حقیقت بلاشبہ رُوس اور اشتراکی بلاک نے اشتراکیت زدہ عرب ملکوں کی بھی مدد کی ہے مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس نے مصر، شام اور الجزائر کو آج تک جو امداد دی ہے وہ اُس امداد کا ایک فیصد بھی نہیں ہے جو اُس نے اسرائیل کو دی ہے۔ اسرائیل نے صنعتی ترقی کا قصر روس اور مشرقی یورپ کی امداد سے تعمیر کیا ہے اور عسکری طاقت مغربی بلاک کی امداد سے فراہم کی ہے۔ بخلاف اس کے عربوں نے اشتراکی کیمپ سے جو اسلحہ بھی حاصل کیا ہے اُسے اپنے سرمائے سے خریدا ہے یا پھر اُن قرضوں سے خریدا ہے جو انہوں نے اپنے بعض منصوبوں کی تکمیل کے لیے مانگے تھے اور جو بہر صورت واجب الادا ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عربوں کو جو امداد، اسلحہ اور قرض ملا ہے اُسے تو مشرق و مغرب کے پریس نے خوب اچھالا ہے اور اُس کے اعداد و شمار سے دنیا بھر کو اطلاع دی ہے۔ مگر اسرائیل کو جو امداد دی گئی ہے اشتراکی کیمپ نے اُسے دانستہ

پردۂ راز میں رکھا ہے تاکہ عربوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور عربوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات متاثر نہ ہوں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے امریکہ اور روس دونوں نے مصر کو اسرائیل پر حملہ کرنے سے روکا تھا، درآنحالیکہ دونوں کو یہ معلوم تھا کہ اسرائیل ۵ جون کو مصر پر حملہ کرنے والا ہے۔ پھر اس جنگ میں شکست کھانے کے بعد مصر کو روس سے جتنے ہتھیار بھی ملے ہیں وہ حملہ کے نہیں بلکہ صرف مدافعت کے ہتھیار ہیں، حالانکہ اسرائیل کو مغربی ملکوں سے جو ہتھیار مل رہے ہیں وہ سب کو معلوم ہے کہ حملے کے ہتھیار ہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ روس اپنے زیر دست اشتراکی عرب ممالک کو سختی کے ساتھ اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقے حاصل کرنے کے لیے صرف سیاسی سمجھوتے پر اکتفا کریں اور لڑنے کا نام نہ لیں۔ حالانکہ وہ یہ بات خوب جانتا ہے کہ سیاسی ذرائع سے اسرائیل عرب سرزمین کا ایک انچ بھی واپس نہ دے گا۔

اسرائیل کو تیل کہاں سے ملتا ہے؟ ایک خاص پہلو جس پر کسی اہلِ علم نے آج تک گفتگو نہیں کی اور نہ ثقہ شہادتوں کی روشنی میں اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل کو پٹرول کہاں سے ملتا ہے اور کیسے ملتا ہے؟ جس طرح مسئلہ فلسطین اور دوسرے عرب مسائل مثلاً اتحادِ عرب وغیرہ کے بارے میں عرب عوام کے ذہنوں میں غلط تصورات بیٹھ چکے ہیں، اسی طرح اسرائیل کے پٹرول کے ذرائع کے بارے میں بھی طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس بارے میں ہمیں تین نقطۂ نظر ملتے ہیں۔ ہر نقطۂ نظر کا علمبردار گروہ اطلاعات کے ایسے مآخذ کے بل پر اپنے موقف کی بنیاد استوار کرتا ہے جنہوں نے پچھلے دس سالوں کے عرصہ میں صحیح رہنمائی اور عوام کی صحیح تربیت کے بارے میں کوہ قامت غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ایران اسرائیل کو پٹرول دیتا ہے، دوسرا گروہ اس رائے کا علمبردار ہے کہ اسرائیل خلیج عربی کی ریاستوں سے پٹرول حاصل کرتا ہے، اور تیسرے گروہ کا جواب یہ ہے کہ صرف امریکی اور برطانوی کمپنیاں ہی صہیونی ریاست کو عربی پٹرول کی سپلائی کرتی چلی آرہی ہیں۔

لیکن ہمارے پاس تین ایسے ثقہ ذرائع ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے امر واقع اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب عراق کا پٹرول، جو کرکوک سے حیفا تک پائپ لائن کے ذریعہ جاتا تھا، منقطع کر دیا گیا تو اس کے بعد اسرائیل نے رومانیہ سے پٹرول کی امداد طلب کی۔ کیونکہ رومانیہ تیل کی دولت سے مالامال ہے۔ اور رومانیہ اسرائیل کا گہرا دوست سمجھا جاتا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ رومانیہ کے مضبوط روابط

قائم ہیں اور بے شمار اقتصادی، تجارتی، ثقافتی اور فنی رشتوں میں دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ماسکو کے اشارے پر رومانیہ نے عراقی پٹرول بند ہوتے ہی اپنے دوست اسرائیل کو بافراط پٹرول کی سپلائی جاری کر دی[۱]۔

۱۹۵۵ء میں روس نے اسرائیل کو ۵۰ ملین ڈالر کا قرض اس غرض کے لیے دیا کہ اسرائیل اپنی ضرورت کا تیل روس سے خرید سکے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا قرض تھا جو ماسکو نے ایک بیرونی ملک کو پیش کیا[۲]۔

۱۹۶۱ء میں اسرائیل نے تیل کا ذخیرہ کرنے کے لیے اٹلی کی تیل کمپنی امینی سے بھاری بھرکم مقدار حاصل کی، یہ کمپنی مغربی یورپ کی وہ واحد کمپنی ہے جو روس سے تیل درآمد کرتی ہے اور اُسے اٹلی میں اور چند افریقی ممالک میں فروخت کرتی ہے۔

پانچ سال سے اسرائیل نے خود صحرائے نقب سے تیل نکالنا شروع کر دیا ہے۔ صحرائے نقب کا تیل اُس کی سالانہ ضرورت کا ۳۵-۴۰ فیصد پورا کر دیتا ہے۔ اور بقیہ ضرورت وہ بیرونی تیل سے پوری کرتا ہے[۳]۔

اسرائیل کی سیاست ماسکو کی خواہش سے ہم آہنگ ہے سیاسی میدان میں اسرائیل مغربی کیمپ سے گہرے تعلقات اور اس سے ہمہ گونہ امداد حاصل کرنے کے باوجود ایسی پالیسی پر گامزن ہے جس کے بنیادی اور اہم نکات روس کی خواہش کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت اسرائیل نے روس کے حسبِ ذیل مطالبات کو کماحقہٗ پورا کیا ہے:

۱۔ اسرائیل آج تک مغرب کے کسی ایسے سیاسی یا عسکری معاہدے میں شامل نہیں ہوا جو اشتراکی بلاک سے، جس کا قائد ماسکو ہے، متصادم ہوتا ہو۔

۲۔ امریکہ کی مخالفت کے باوجود اسرائیل نے چین میں ماؤزے تنگ کے نظام کو تسلیم کیا۔

۳۔ اسرائیل نے پولینڈ کی نئی حدود کو تسلیم کر لیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ جرمنی اپنے مشرقی علاقوں سے مستقل طور پر محروم ہو جائے گا اور وہ علاقے پولینڈ کا حصہ تسلیم کیے جائیں گے۔ اسرائیل کے اس اعتراف سے مغربی یورپ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے اور جرمن حلقوں میں صہیونیوں کے خلاف شدید انتقامی جذبات اُبھر آئے ہیں،

[۱] ملاحظہ ہو اقتصادی مطالعہ کے دفتر کی رپورٹ (روم ۴۹ ۱۹ء)

[۲] ملاحظہ ہو جنرل فاؤنڈیشن برائے تجارتِ خارجہ کی رپورٹ (بروکسل ۱۹۵۵ء)

[۳] ملاحظہ ہو اقتصادی تحقیقات کے دفتر کی رپورٹ (پیرس ۱۹۶۲ء)

کیونکہ پولینڈ کی نئی حدود کو روس اور وارسا پیکیٹ کے ممالک اور اسرائیل کے سوا کسی نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔

۴۔ اسرائیل ماسکو کے نقشۂ سیاست کی غیر مشروط حمایت کرتا رہتا ہے۔ خاص طور پر برلن کے معاملہ میں اور جرمن قوم کے اتحاد کی مخالفت کے بارے میں۔

۵۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اسرائیل اشتراکی کیمپ کا ہمنوا رہا ہے۔

۶۔ اسرائیل کی تمام بائیں بازو کی پارٹیاں اور مزدوروں کی تنظیمیں ان تمام کانفرنسوں میں شرکت کرتی ہیں جو ماسکو، پراگ، صوفیا، بلغراد، بڈاپسٹ اور وارسا میں منعقد ہوتی ہیں اور پُرامن بقائے باہم اور استعمار اور ان تمام نظریات کی بیخ کنی کے منصوبے بناتی ہیں جو اُن کی نگاہ میں "رجعت پسندانہ" ہوتے ہیں۔

روس کی طرف سے پُرامن بقائے باہم کی دعوت | جہاں تک عرب ممالک کا معاملہ ہے روس نے پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء کے اوائل میں اِس علاقہ میں اپنے اثرات پھیلانے شروع کیے ہیں۔ اس وقت سے رُوس نے اس علاقے سے متعلق اپنی پالیسی کو سائنٹفک سوشلزم (مارکسزم) کی دعوت اور عربوں اور اسرائیل کے مابین پُرامن بقائے باہم کی بنیاد پر وضع کر رکھا ہے۔ بقائے باہم کے دوسرے معنی اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس سے صلح کر لینے کے ہیں، اور صلح کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ عرب فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کو جائز مان لیں۔ اس سے یہ واضح ہُوا کہ دنیائے عرب میں بقائے باہم کی جو دعوت پھیلائی جا رہی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس ملعون نظریے کی اشاعت کی جا رہی ہے اس کا مقصدِ وحید ایسے "پُرامن حالات" پیدا کرنا ہے جو اس دعوت اور نظریے کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ہو سکتے ہوں۔ یہ حقیقت خود روسی لیڈروں نے ہر موقع و مناسبت پر واضح کی ہے اور اُن تمام کانفرنسوں میں اس کی صدائے بازگشت سُنی گئی ہے جو ماسکو میں ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۶ء میں منعقد ہو چکی ہیں۔ خروشیف نے جب ۹ر مئی ۱۹۶۴ء کو قاہرہ کا دورہ کیا تھا تو اس نے صدر جمال عبدالناصر کو "ہیرو آف روس" کا خطاب دیتے ہوئے صراحت سے کہا تھا:

"سوویت یونین کی حکومت پُرامن بقائے باہم کے اصُول کی پابند ہے اور اس پر قائم ہے۔ عربوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اس علاقے میں امن کی ضمانت فراہم کرنے اور اس علاقے کی تمام اقوام کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنے کے لیے اس اصول کو اپنی سیاستِ خارجہ کا محور بنائیں۔ علاقے کی

اقوام سے مراد عرب اور اسرائیل ہیں“

خروشیف نے عرب قومیت پر بھی شدید تنقید کی اور کہا: ”اشتراکیت کسی قومی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ اشتراکیت مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد کی علمبردار ہے ....“

خروشچیف کے بعد کوسیجن اور بریزنیف اور پڈگورنی نے بھی روس کی اس پالیسی کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ:

”روس پُرامن بقائے باہم کے راستے کا پابند ہے اور اسی بنیاد پر وہ ترقی پسندانہ (یعنی اشتراکی) تحریکوں کا پُرجوش حامی اور مؤید ہے[1]“

کمیونسٹ حلقوں کی طرف سے آزادیِ فلسطین کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا جو بات عرب عوام کو خاص طور پر معلوم ہونی چاہیے، اور جسے عرب پریس نے عوام کو بتانے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی وہ یہ ہے:

الف: جس روز سے اسرائیل کے منحوس وجود نے جنم لیا ہے اُس روز سے آج تک ماسکو یا کمیونسٹ بلاک کے دوسرے شہروں میں کمیونسٹ پارٹیوں اور بائیں بازو کی جماعتوں کی جتنی کانفرنسیں اور اجتماعات ہوئے ہیں اُن کے پورے ریکارڈ میں کسی ایسی سفارش یا قرارداد کا نشان نہیں ملتا جس میں فلسطین کا ذکر ہو، یا فلسطین کو عرب علاقہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہو، یا فلسطین کی آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی بھی کوئی سفارش یا اپیل یا قرارداد نہیں ملتی جس میں اسرائیل کے وجود پر کوئی مخالفانہ کلمہ کہا گیا ہو، یا اس کے توسیعی منصوبوں کی مذمت کی گئی ہو۔

ب: ”افریشیائی تنظیم“ کی کانفرنسوں میں بھی جو قراردادیں پاس کی گئی ہیں اُن کی پوری رُوداد میں ایسی کوئی قرارداد موجود نہیں ہے جو ٹھوس انداز میں فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کے نظریہ کی حمایت کرتی ہو، اور اسرائیل کو استعمار کی تخلیق کردہ غیر قانونی ریاست تصور کرتی ہو۔ ”افریشیائی تنظیم“ نے، جس کا مستقل مرکز قاہرہ میں ہے، اپنی تمام سفارشات اور قراردادوں کے اندر مسئلۂ فلسطین کے بارے میں حد سے حد جو باتیں کہی ہیں وہ اس طرح کے رسمی الفاظ میں ادا کی گئی ہیں: ”عرب پناہ گزینوں کی بحالی کا حق“ — ”اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی پابندی“ —

ج: بلگانن، خروشیف اور کوسیجن تینوں کے عہد میں عرب حکمرانوں نے روسی زعماء کے ساتھ جتنے سیاسی

---

[1] ملاحظہ ہو: روس کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی رپورٹ مطبوعہ ماسکو، ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء۔

اور اقتصادی مذاکرات کیے ہیں اور ان کے خاتمہ پر جتنے مشترکہ بیانات جاری کیے گئے اُن میں سے کسی بیان میں آج تک فلسطین کی آزادی کا کبھی ذکر نہیں آیا ہے اور نہ کسی ایسی ذمہ داری کا عہد کیا گیا ہے جس کی رُو سے ماسکو فلسطین پر عربوں کے حق کی بحالی کے لیے ان کی مدد کرنے کا پابند ہوتا ہو۔ ان تمام بیانات میں مسئلۂ فلسطین کے بارے میں اس سے زیادہ کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ "فلسطینی عربوں کے حقوق کی حمایت کی جاتی ہے" حمایت کا جو مفہوم ماسکو کے پیشِ نظر ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ماسکو ان حقوق کی بحالی میں حصہ لے گا یا فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کی موافقت کرے گا، بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے تحت مہاجرین کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔

عرب پریس کا گمراہانہ پروپیگنڈا جعل سازی، فریب دہی اور تحریف و تضلیل کے ہتھکنڈوں نے عرب تاریخ کے نازک سے نازک مراحل میں بھی انتہائی خطرناک اور نقصان دہ کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف سیاسی اور نظریاتی تشدد نے اربابِ فکر و سیاست اور آزاد اہلِ قلم کے حلقوں میں ایسی خوفناک فضا پیدا کیے رکھی ہے کہ حقیقت کی جستجو اور حقیقت کے اظہار کا ہر جذبہ اپنی موت مر گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، اگرچہ یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عرب رائے عامہ کو گمراہ کرنے میں ان لوگوں نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ عرب پریس سالہا سال سے عرب عوام کو یہ یقین دلاتا رہا ہے کہ روس نے اپنے عرب اشتراکی دوستوں سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ عربوں پر جب کبھی حملہ ہوگا، روس اُسے ناکام کرنے کے لیے عملی اقدامات کرے گا۔ نیز اُس نے یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لے رکھی ہے کہ وہ فلسطین کی جنگِ آزادی میں عربوں کے دوش بدوش شرکت کرے گا۔ مگر ۵ جون ۱۹۶۷ء کو بلی تھیلے سے باہر آگئی اور روس کا حقیقی رویہ طشت از بام ہوگیا۔ روس نے اس تباہ کن جنگ میں اسرائیلی جارحیت کو فنا کرنے کے عملی اقدامات کے بجائے صرف کھوکھلے بیانات پر اکتفا کیا۔ ہمیں روس کے اس رویے پر انگشتِ حیرت منہ میں لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور نہ روس کو کوئی ملامت ہی کی جانی چاہیے: کیونکہ روس نے عربوں کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کبھی اس بنیاد پر استوار نہیں کیے تھے کہ وہ صیہونیت کی بیخ کنی کے لیے عربوں کی دستگیری کرے گا یا فلسطین کے اندر عربوں کو ان کا حق واپس دلائے گا۔ روس کو بھی

مغربی ممالک کی طرح عربوں کی دوستی سے اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں ہے کہ وہ عرب ممالک میں اپنے مفادات کی حفاظت کر سکے اور اپنے سیاسی اثرات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا سکے۔ لہٰذا یہ روس کا نہیں بلکہ عرب پروپیگنڈہ بازوں کا قصور ہے کہ انہوں نے خود اپنی سہرا باندھنے کے لیے عرب عوام میں روس کے متعلق بے بنیاد توقعات پیدا کیں۔

۲- عرب پریس نے عرب اقوام کے ذہنوں میں دشمن کی طاقت اور اس کی فوجی تیاریوں اور اس کے اقتصادی اور سیاسی حالات کے بارے میں بلاتحقیق غلط اندازے بٹھائے یہاں تک کہ جنگ سے صرف چار ہفتے قبل اس بار میں مغالطہ انگیز اور من گھڑت اعداد و شمار شائع کیے جن سے عرب عوام مطمئن ہو گئے کہ اسرائیل شدید اقتصادی بحران میں گھرا ہوا ہے۔ اسرائیل میں بے روزگاروں کی تعداد صرف شہری مزدوروں کے اندر ۹۶ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اُن یہودیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے جو اسرائیل سے مغربی یورپ اور امریکہ واپس جا رہے ہیں اسرائیل کی فوج جس کی کل تعداد مردوں اور عورتوں سمیت ۲ لاکھ ہے، اس کے پاس جتنے جہاز، ٹینک اور توپیں ہیں وہ تمام عرب افواج کے مجموعی اسلحہ کے مقابلے میں صرف ۲۰ اور ۲۳ فیصد ہیں۔ ان غلط معلومات اور بے بنیاد اندازوں نے جنگی مہم پر گہرا اثر ڈالا اور عرب اپنے دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ضروری تیاری نہ کر سکے۔

۳- عرب پریس کے خابو یافتہ پروپیگنڈے نے ایک نقصان یہ بھی کیا کہ ان شخصیتوں کو جو اقوامِ متحدہ میں فلسطین کے متعلق عربوں کے نقطۂ نظر کی ہمیشہ مخالف رہی ہیں، اور ان شخصیتوں کو جن کے اسرائیل کے ساتھ گہرے فکری اور سیاسی روابط رہے ہیں، عرب کا دوست بنا کر متعارف کرایا ہے۔ بے شک عرب قوم کو دوسری اقوام اور افراد کی دوستی کی بے حد ضرورت ہے۔ جن جن اقوام سے عربوں کی دوستی ہے اُسے مزید ترقی دینا چاہیے۔ لیکن نڈر عرب قوم کو کھوکھلے مظاہر اور خوشنما الفاظ کے دھوکے میں مبتلا کرنا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ امریکہ بلاشبہ عربوں کے مفاد کا دشمن ہے۔ اس سے ضرور ان کو خبردار کیجیے۔ مگر روس بھی عربی مفاد کا حامی اور دوست نہیں ہے۔ اس کے متعلق عربوں کو دھوکے میں رکھنا صریح ظلم ہے۔

۴- ایک اور اہم پہلو ایسا ہے جس کی طرف عرب عوام کی توجہ مبذول نہیں کرائی گئی، وہ یہ ہے کہ اسرائیل میں اس وقت جو سائنس دان ایٹمی تحقیقات کے میدان میں کام کر رہے ہیں اُن کے درمیان اور امریکہ اور روس کے ایٹمی سائنسدانوں کے درمیان نہایت گہرا تعاون پایا جاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ امریکہ کے چند یہودی سائنسدانوں نے

ہی روس تک اٹیمی راز منتقل کیے ہیں۔ اُدھر روس نے سائنسی تحقیقات کے میدان میں اسرائیل کے ساتھ ہر نوعیت کے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور ایٹم کے مشہور یہودی سائنسدان ڈاکٹر لانڈو اور روسی یونیورسٹیوں کے دوسرے اساتذہ کو اسرائیل کے تصرف میں دے رکھا ہے۔

[اس مضمون کے مصنف ڈاکٹر ابراہیم الشریقی عرب دنیا کی نامور علمی اور سیاسی شخصیت ہیں۔ متعدد انٹرنیشنل سائنس اکیڈمیوں کے ممبر ہیں۔ متعدد یورپین یونیورسٹیوں کے وزٹنگ پروفیسر بھی ہیں۔ انہوں نے اس مضمون کی تیاری میں جن ماخذ سے استفادہ کیا ہے اُن کی اپنی تشریح کے مطابق وہ درج ذیل ہیں:-]

۱- اقوام متحدہ کے اجلاسوں کی کارروائیاں۔

۲- بین الاقوامی منشوں کی رپورٹیں۔

۳- اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے درمیان معاہدات کی دستاویزات۔

۴- یورپ اور امریکہ کے یہودی اداروں کے اعلامیے۔

۵- بین الاقوامی دستاویزات اور تعلقات کی انسائیکلوپیڈیا" طبع اول برلن ۱۹۳۸ء

۶- "صہیونی تحریک کی تاریخ"، پیرس ۱۹۵۰ء

۷- حاییم وائسمین کی ڈائری: "مشرق کی بیداری اور صہیونی تحریک" مؤلفہ جوزف سٹیلے۔ مڈریڈ ۱۹۴۶ء

۸- "صہیونیت اور بالشویک انقلاب" مؤلفہ پروفیسر ساٹیننے، میلانو ۱۹۲۶ء

۹- "عالمی جنگ کے چند راز" مؤلفہ اندرے لینو، پیرس ۱۹۲۴ء

۱۰- "موعودہ سرزمین کی طرف" مؤلفہ پروفیسر زانڈا، پراگ ۱۹۳۷ء

۱۱- "شالن سے وائسمین تک" مؤلفہ ارمانڈ شنیٹر، پیرس ۱۹۴۹ء

۱۲- "یالٹا سے پوٹسڈم تک" مؤلفہ جان سوریل، سان فرانسسکو، ۱۹۴۷ء

۱۳- سٹیٹینیوس (روز ویلٹ حکومت کے وزیر خارجہ) کی ڈائری۔

۱۴- ماسکو، صوفیا، پراگ وغیرہ کی کمیونسٹ کانفرنسوں کی رودادیں۔

انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

اسلامی قانون میں

—— (۵) ——

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر (ترجمہ : معروف شاہ شیرازی)

قتل سے کم درجے کی جسمانی مضرت

اس سے قبل صرف ان جرائم سے بحث کی گئی ہے جن کے نتیجے میں موت واقع ہو جاتی ہے، خواہ ان کا ارتکاب عمداً کیا گیا ہو یا خطاءً۔ اب ہم ان جرائم سے بحث کریں گے جن کے نتیجے میں موت واقع نہیں ہوتی۔ فقہاء نے ایسے جرائم کی چار اقسام بتائی ہیں:

۱۔ اعضائے جسم کا کاٹ پھینکنا، یا جو اس کے حکم میں ہو۔
۲۔ کسی عضو کی ظاہری شکل باقی رہتے ہوئے، اس کی افادیت اور کارکردگی کا ختم کرنا۔
۳۔ شجاج (SKULL FRACTURE) یعنی سر پھوڑنا۔
۴۔ زخمی کرنا۔

ان میں سے پہلی دو قسمیں، اپنی حقیقت کے اعتبار سے چونکہ ایک ہی ہیں اس لیے میں ایک ہی جگہ دونوں پر بحث کروں گا۔ کیونکہ کسی عضو کا کاٹ دینا اور اس کے منافع کا جاتے رہنا، دونوں صورتوں میں نقصان برابر ہے۔ البتہ شجاج (سر پھوڑنے) اور دوسرے زخموں (جرح) پر علیحدہ علیحدہ بحث ہو گی۔

اس بات کے پیش نظر کہ بالارادہ (قصداً) کیے جانے والے جرائم کے ضمن میں، مَیں نے اکثر وبیشتر ان صورتوں کا ذکر کیا ہے جن میں قصاص واجب نہیں ہوتا اور اکثر اوقات ان حالات میں وہی احکام ہوتے ہیں جو بلا ارادہ (خطاً)،

ارتکاب کی صورت میں ان جرائم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ مال جو دیت یا معاوضے میں واجب ہوتا ہے۔ یہاں میں نے یہ مناسب سمجھا کہ جن جرائم میں قصاص نہیں ہوتا اور جن کا ارتکاب بطور خطا ہوا ہو، ان تمام بحثوں میں، ان کا ایک ہی جگہ ذکر کیا جائے۔

لیکن ان اقسام پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ قتل سے کم درجے کی جسمانی مضرت کی شکل میں نفاذِ قصاص کی شرائط کا ذکر بھی کر دوں۔ کیونکہ ان شرائط کا تعلق اس قسم کے جرائم کی تمام اقسام سے ہے۔

ایسے جرائم میں نفاذِ قصاص کی شرائط چونکہ قتل سے کم تر درجے کے جرائم میں قصاص کی سزا اسی اصول کے مطابق ہوتی ہے جیسے قتلِ نفس میں ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ جرم اور سزا کے درمیان پوری پوری مساوات ہو۔ لہٰذا مجرم کو اسی قدر سزا دی جائے گی، جس قدر اس نے شخص متضرر کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ قتل کی صورت میں نفاذِ قصاص کے لیے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، قتل سے کم درجے کی بالارادہ جسمانی مضرتوں میں بھی فی الجملہ ان کا پایا جانا ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہ مجرم عاقل، بالغ، خود مختار اور عمداً اس فعل کا ارادہ کرنے والا ہو اور شخص متضرر ہر لحاظ سے معصوم الدم ہو، مجرم کا جزو (اولاد) نہ ہو اور جرم اور ضرر کا وقوع براہِ راست ہوا ہو۔ ان شرائط پر اس سے قبل ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں[1]۔

قتل کے جرم میں قصاص چونکہ مجرم کی موت پر منتج ہوتا ہے، اس لیے اس بات کا سرے سے موقع ہی نہیں رہتا کہ اس کے نفاذ سے مجرم کو کچھ مزید نقصان بھی پہنچے گا۔ یا اس میں کسی قسم کی زیادتی ہو جائے گی۔ لیکن

---

[1] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۷ اور اس میں ہے: "ان میں سے بعض شرائط وہ ہیں جو نفس انسانی اور اس سے کم درجے کے دوسرے جرائم کو بھی شامل ہیں۔ مثلاً یہ کہ مجرم عاقل، بالغ، خود مختار، عمداً فعل کا ارتکاب کرنے والا اور شخص متضرر ہر لحاظ سے معصوم الدم ہو، مجرم کا جزو (اولاد) اور مملوک نہ ہو اور یہ کہ جرم کا وقوع براہ راست ہوا ہو۔" — بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، ابن رشد، ج ۲ ص ۳۳۹ اور اس کے بعد — الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۲۲۱ — الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ، ص ۲۶۰ — المغنی ابن قدامہ، ج ۹ ص ۴۱۶۔

قتل سے کم درجے کی مضرتوں میں قصاص کے نفاذ کی صورت حال اس سے سراسر مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں پیش نظر صرف ایک عضو کو کاٹنا یا ایک خاص مقدار کا زخم کرنا ہوتا ہے۔ اور مجرم کو قتل کرنا مطلوب نہیں ہوتا جسم انسانی ایک مربوط وحدت اور اکائی ہوتی ہے۔ اور اس بات کا امکان رہتا ہے کہ اجرائے قصاص سے جسم کے کچھ دوسرے اعضاء متاثر ہو جائیں، یا مجرم کی جان ہی چلی جائے۔ حالانکہ نفاذ قصاص کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ مجرم کو اسی قدر نقصان پہنچایا جائے جس قدر اس کے جرم کا تقاضا ہے۔ اس میں کمی بیشی نہ ہو تاکہ قصاص کی وجہ سے مجرم پر ظلم نہ ہو اور اسے کوئی ایسی سزا نہ دے دی جائے جس کے مقابلے کا جرم نہ ہو یا وہ نقصان اس جرم میں شامل نہ ہو، جس کی وجہ سے قصاص واجب ہوا۔ اس لیے فقہاء نے بعض ایسی شرائط بھی بیان کی ہیں جن کا تعلق قتل سے کم درجے کی جسمانی مضرتوں سے ہے۔ ان میں سے اہم شرائط یہ ہیں کہ جرم و سزا میں مماثلت ہو اور اس بات کا امکان موجود ہو کہ مجرم نے متضرر کو جو نقصان پہنچایا ہے، بعینہٖ وہی نقصان مجرم کو پہنچایا جا سکے، یعنی مماثلت پوری طرح ممکن ہو۔

۱۔ مماثلت کا مفہوم یہ ہے کہ جرم کے نتیجے میں جو ضرر واقع ہوا، سزا کے نتیجے میں واقع ہونے والا ضرر اس کے مماثل ہو۔ کیونکہ اعضائے جسم کے مواقع اور منافع مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا ناک کے بدلے آنکھ نہ نکالی جائے گی، دائیں کے بدلے بایاں نہ کاٹا جائے گا اور نہ بائیں کے بدلے دایاں، نہ اوپر کا دانت نچلے کے بدلے اور نہ اس کے برعکس۔ بلکہ دائیں کے بدلے دایاں، بائیں کے بدلے بایاں، اوپر کے دانت کے بدلے اُوپر کا دانت، نچلے دانت کے بدلے نچلا دانت نکالا جائے گا۔

۲۔ اور مماثلتِ تامہ کا مفہوم یہ ہے کہ مجرم کو اس کے فعل جیسا نقصان پورے کا پورا پہنچانا ممکن ہو اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب کسی عضو کو جوڑ سے کاٹا جائے۔ یا یہ کہ اس کی ایک حد مقرر ہو۔ ان دونوں شرائط کے التزام کے بعد کسی قسم کے ظلم اور تعدی کا امکان نہیں رہتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مدعا پورا ہو جاتا ہے اَلْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ لیکن اگر مماثلت نہ ہو یا جرم کے مطابق پوری سزا کا نفاذ ممکن نہ ہو تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔[1]

---

[1] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۷۔ اس میں لکھتے ہیں: جن اعضاء سے صدورِ جرم ہوا اور جن پر وقوعِ سزا ہوا ان کے ۲

جیسا کہ بعد میں ہم بالتفصیل بتائیں گے، فقہاء کے درمیان قصاص کے بعض مسائل میں اختلافات ضرور واقع ہوئے ہیں لیکن یہ اختلافات ان شرائط کے متعلق نہیں جن کا وجود نفاذ سزا کے لیے ضروری ہے، بلکہ اختلافات بعض جزئی مسائل کے بارے میں ہیں۔ مثلاً زبان کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ زبان کاٹ دینے کی صورت میں قصاص کا نفاذ ہوگا اور دوسرا فریق اس طرف گیا ہے کہ اس میں قصاص نہ ہوگا۔ جو حضرات قصاص کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ زبان کی ایک مضبوط جڑ ہے لہٰذا اُسے جوڑ سمجھا جائے گا۔ اور یہ بات ممکن ہوگی کہ مجرم نے جس قدر زبان کاٹی ہے اُسی قدر مکمل بدلہ اس سے لیا جاسکے۔ لیکن جو لوگ قصاص کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ زبان سکڑتی پھیلتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس بات کا امکان

---

۵ - درمیان افعال و منافع کی مماثلت ضروری ہے۔ نیز دونوں کا تاوان ایک جیسا ہونا چاہیے، کیونکہ قتل سے کم درجے کے جرائم میں جرم و سزا کے درمیان حتی المقدور مماثلت ضروری ہے اور مماثلت نہ رہنے سے قصاص کا وجوب ختم ہو جاتا ہے تب۔ اس میں انہوں نے ان دلائل عقل و نقل کا ذکر بھی کیا ہے جن کی وجہ سے مماثلت ضروری ہے۔ مثلاً آیت: اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ " جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ (مائدہ ۴۵) اور آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ " اگر تم سزا دو تو ویسی ہی سزا دو جیسی تمہیں دی گئی " اور دوسری آیت: مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا " جس نے کسی برائی کا ارتکاب کیا۔ تو اسے اس کے مماثل ہی سزا دی جائے " نیز یہ کہ قتل سے کم تر درجے کے جرائم کے نتیجے میں جو نقصان ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت مالی نقصان جیسی ہے لہٰذا جرم و سزا میں مماثلت ضروری ہوگی جیسا کہ مالی مضرت میں ضروری ہوتی ہے۔ الکاسانی نے یہاں استیفائے مثل کے امکان سے بھی بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

" یہ کہ جرم کے مماثل سزا کا اجراء ممکن ہو۔ کیونکہ اگر جرم کے مماثل سزا کا اجراء ہی ممکن نہ ہو تو لازماً قصاص کا اجرا ممکن نہ رہے گا۔ لہٰذا وہ واجب نہ رہے گا" تبیین الحقائق شرح کنز، ج ۶ ص ۱۱۱۔

نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۷، ص ۲۸ اور اس کا مابعد۔ کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۳ ص ۳، ۴ اور اس کا مابعد۔

نہیں ہے کہ مجرم نے جس قدر زبان کاٹی، اسی قدر اس کی زبان کاٹ لی جائے۔ بہرحال فریقین کے درمیان اس بات پر اتفاق ہے کہ قصاص تب ہی جاری ہو گا جب پُورا پُورا بدلہ لیا جا سکتا ہو۔ ان کے نزدیک اس شرط کے وجوب میں اختلاف نہیں ہے البتہ اختلاف اس میں ہے کہ زبان میں یہ شرط پائی جاتی ہے یا نہیں۔ دوسرے اعضاء جن کے بارے میں اختلاف ہُوا۔ اس کی نوعیت بھی بعینہٖ ایسی ہی ہے جیسا کہ زبان کے بارے میں بیان ہُوا۔

کیا ایک کے بدلے متعدد اعضاء کاٹے جائیں گے اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ قتل سے کم درجے کے جرائم میں اگر مجرم متعدد ہوں تو کیا سب پر قصاص کی سزا نافذ ہو گی؟ بعض فقہاء نے اس مسئلے میں قتل اور قتل سے کم درجے کے جرائم قصاص کے حکم میں فرق کیا ہے۔

ظاہر یہ کہتے ہیں دو یا اس سے زیادہ ہاتھ ایک ہاتھ کے بدلے میں نہ کاٹے جائیں گے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک ہاتھ کے بدلے متعدد ہاتھ بھی کاٹے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے نزدیک ایک جان کے بدلے متعدد جانیں لی جا سکتی ہیں۔ لیکن حنفیہ نے قتل اور اس سے کم تر درجے کے جرائم قصاص کے حکم میں اس پہلو سے فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک عضو کے بدلے متعدد اعضاء نہ کاٹے جائیں گے جبکہ ایک جان کے بدلے ان کے نزدیک بھی متعدد جانیں لی جائیں گی۔

جو لوگ قتل سے کم درجے کے جرائم قصاص میں مجرمین کے تعدد کی صورت میں نفاذِ قصاص کے قائل نہیں ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ قتل سے کم درجے کے جرائم میں نفاذِ قصاص کے لیے مماثلت واجب ہے لیکن ایک ہاتھ کے مقابلے میں متعدد ہاتھ کاٹنے میں مماثلت نہیں ہے۔ کیونکہ دو یا اس سے زیادہ ہاتھ ایک ہاتھ کا مثل نہیں بن سکتے۔ اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دونوں مجرمین میں سے ہر ایک نے ہاتھ کا ایک حصہ کاٹا ہو، اس لیے کہ ہاتھ کے حصے کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن قتل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ قتل (یعنی جسم سے جان کے نکلنے) کو اجزاء میں منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں ہاتھ کے ایک حصے کے بدلے پُورے ہاتھ کا کاٹنا مماثلت کے خلاف ہے۔

حالانکہ مماثلت از روئے نص واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: العین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص "آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے

بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں میں برابر کا بدلہ۔" اسی طرح کی دوسری آیات پہلے حاشیے میں نقل ہو چکیں۔

۲- یہ کہ قتل سے کم درجے کے جرائم قصاص کو قتل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قتل نفس میں مساوات معتبر نہیں ہے۔ وہاں مریض کے بدلے صحیح الجسم قتل ہوتا ہے اور سلیم الجسم کے بدلے ناقص الاعضا مارا جاتا ہے۔

۳- قتل کے ارتکاب میں متعدد مجرمین بالعموم شریک ہو جایا کرتے ہیں، لیکن قتل سے کم درجے کے جرائم میں اشتراک عمل کم ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں حالتوں کے حکم میں اختلاف واجب ہو جاتا ہے۔

۴- قتل سے کم درجے کے جرائم قصاص مالی نقصان کا درجہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان میں مکمل مماثلت ملحوظ رکھی جائے گی جیسا کہ دوسری مالی مضرتوں میں رکھی جاتی ہے۔

اور جو لوگ مجرمین کے تعدد کی صورت میں، قتل سے کم درجے کے جرائم قصاص میں بھی ایک کے بدلے متعدد اعضاء کے کاٹے جانے کے قائل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱- حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے سامنے دو افراد نے ایک شخص کے خلاف چوری کی گواہی دی۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اس کے بعد انہی دو گواہوں نے یہ گواہی دی کہ ہم نے سابقہ گواہی میں غلطی کی ہے۔ اصل چور وہ شخص نہ تھا بلکہ یہ دوسرا شخص ہے۔ آپ نے دوسرے شخص کے خلاف ان کی گواہی مسترد کر دی اور ان پر پہلے شخص کے بیے تاوان عاید کیا۔ اور کہا کہ اگر مجھے اس بات کا علم ہو کہ تم لوگوں نے جان بوجھ کر اس کے خلاف غلط شہادت دی ہے تو میں تم دونوں کے ہاتھ کاٹ دیتا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ہاتھ کے بدلے متعدد ہاتھ کاٹنے کے قائل تھے۔

۲- یہ کہ جرائم قصاص کی دو قسمیں ہیں، قتل اور اس سے کم تر درجے کے جرائم۔ اگر قتل میں ایک کے بدلے متعدد جانیں لی جاتی ہیں تو کم درجے کے جرائم میں بھی ایک کے بدلے متعدد افراد پر سزا نافذ ہو گی۔[۱]

میں سمجھتا ہوں کہ جرم قتل اور کم درجے کے جرائم کی نوعیت ایک ہی ہے لہٰذا دونوں میں ایک متضرر کے بدلے متعدد مجرمین پر سزا نافذ ہو گی۔ ایک تو ان دلائل کی بنا پر جو اس رائے کے قائلین دیتے ہیں اور

[۱] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۷-۲۹۹- بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، ابن رشد، ج ۲ ص ۳۲۹- القصاص فی الشریعۃ الاسلامیہ، ڈاکٹر احمد محمد ابراہیم، ص ۱۵۲ اور اس کے بعد۔

دوسرے اس لیے کہ نفس کے علاوہ دوسرے اعضاء کی حیثیت مال کی طرح نہیں ہے، جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔ لہٰذا ان کے احکام مالی مضرت کی طرح نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اعضائے جسم بہر حال جسم کا جزو ہیں۔ نیز یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ مجرمین کے تعدد کی صورت میں اکثر اوقات لوگ قصاص کی سزا سے بچ نکلیں گے۔ کیونکہ مجرمین کے لیے یہ آسان ہو گا کہ وہ تعدد کو بچاؤ کی حیثیت سے استعمال کریں، جیسا کہ قتل کی صورت میں اکثر اوقات ہوتا ہے۔

لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ متعدد مجرمین میں ہر ایک کے انفرادی فعل کی علیحدہ نشان دہی ممکن نہ ہو۔ اور انہوں نے جرم کا ارتکاب بالاتفاق اور یکبارگی کیا ہو۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو، اور ہر ایک کا فعل علیحدہ معلوم و متعین ہو جائے تو ہر ایک کو اس کے فعل کے مطابق سزا دی جائے گی۔

شراب و قمار

(۵)

(جناب ریاض الحسن صاحب)

موجودہ زمانے میں بیسیوں نشیات انسان کے علم میں ہیں۔ ان میں سے کچھ الکوہل سے زیادہ مضر ہیں اور کچھ اس کی بہ نسبت کم نقصان دہ ہیں لیکن یہ سب کے سب یورپ میں ماسوائے الکوہل کے خلافِ قانون ہیں۔ الکوہل کے خلاف بھی مغرب میں بہت پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے اور اب بھی جاری ہے۔ الکوہل امریکہ میں تقریباً ۸۲ سال تک خلافِ قانون بھی رہی ہے۔ اب بھی کسی ملک میں شراب پی کر کار چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے استعمال کو کم کرنے کے لیے تمام دنیا میں الکوہل پر بھاری ٹیکس لگے ہوئے ہیں اور اس کو انسانی ضروریات سے زائد ایک عیاشی کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ جو حکومتیں عوام سے کچھ بھی ہمدردی رکھتی ہیں وہ ان بھاری ٹیکسوں کی آمد سے کہیں زیادہ رقم شراب کے بُرے اثرات کے علاج و ازالہ میں صرف کر دیتی ہیں۔ مثلاً فرانس میں الکوہل کے ٹیکس سے جتنی رقم وصول ہوتی ہے حکومت اس سے دوگنی دولت الکوہل کے مریضوں (ALCOHOLICS) اور ان کے خاندانوں کی دیکھ بھال میں خرچ کر دیتی ہے[1]۔

لیکن عجیب بات ہے کہ مغرب کی پیروی میں مسلمان ملکوں کی حکومتیں شراب کا ٹیکس تو وصول کر لیتی ہیں لیکن اس ٹیکس کے استعمال میں مغربی ملکوں کی پیروی نہیں کرتیں۔ مے نوشوں کی اصلاحِ حال کے لیے کوئی تدبیر اختیار نہیں کی جاتی اور ان کی اولاد کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہم لوگ نقالی بھی اس بھونڈے طریق سے کرتے ہیں کہ اچھائی کا کوئی پہلو ہرگز نہ آنے پاتے اور بُرائی کا کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ ایسی شراب نوشی جو حواس باختہ کر دے دنیا کے تقریباً تمام ممالک

---

[1] ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۵۳ء

میں قانوناً جرم ہے۔ اگرچہ امریکہ میں پولیس اس جرم سے بہت زیادہ تغافل برتتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں اندھا دھند اور بکثرت شراب سے متعلقہ قوانین کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۵ء میں ۱۹۵۵،۷۰ افراد شراب سے متعلقہ قوانین کو توڑنے کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ یہ تعداد اس سال کے کل گرفتار شدگان کا (جن میں سب طرح کے مجرم شامل ہیں) ۴۰ فیصد یعنی تقریباً نصف تھی۔[1]

جس ملک میں شراب سے عشق کا یہ عالم ہو بھلا وہاں جمہوری حکومت کے لیے شراب کو خلافِ قانون[2] قرار دینا کس طرح ممکن ہے؟ ایسے ملک میں ۸۲ سال تک الکوحل کا خلاف قانون رہنا ہی اچنبھے کی بات ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شراب کو مغرب میں کیوں بند نہ کیا جا سکا۔ جبکہ وہاں اس سے کم نقصان دہ نشیات خلافِ قانون ہیں؟

"اس کی وجہ یہ ہے کہ گرجا میں شراب پینا عیسائی نماز کا حصہ ہے۔ عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہونے سے پہلے اپنے حواریوں کو دعوت الوداع دی جس میں ان کے سامنے شراب اور روٹی رکھ کر اپنے مصلوب ہونے کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے بطور استعارہ کہا کہ اے دوستو! یہ شراب جو تم پی رہے ہو یہ میرا خون ہے اور یہ روٹی میرا گوشت ہے۔ جس طرح عیسائیت سے پہلے مشرک مذاہب میں خدا کو جسم میں داخل کرنا روحانی طاقت کا باعث سمجھا جاتا تھا، اسی طرح حضرت عیسیٰ کے (مزعومہ) ارشاد کے مطابق آج تک گرجا میں شراب اور روٹی کو نوش کرنا مقدس ترین عبادت ہے[3]۔"

لیکن اس کو کیا کریں کہ شراب کی خباثت اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ عیسائی سائنسدان اور مذہبی لوگ

---

[1] WORLD ALMANAC 1967 P. 693

[2] جس قوم میں لاکھوں لوگ عمل قومِ لوط میں مبتلا ہوں اور حکومت اپنے کو بے بس پا کر اس کی کھلی چھٹی دے دے وہاں شراب پر پابندی اٹھنے پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ یورپ میں جنسی قوانین بھی بہت نرم ہیں اور جنسی آزادی بھی بہت ہے لیکن پھر بھی چند سنگین جنسی جرائم ابھی تک خلافِ قانون ہیں ان کی خلاف ورزی بھی کچھ زور شور سے کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کنسے رپورٹ کے مطابق:
"اگر موجودہ جنسی قوانین پر عمل کیا جائے (جو مشرقی ممالک کے قوانین سے نرم ترہیں) تو ۹۵ فی صد بالغ آبادی جیل میں ہوگی یا جیل میں کسی نہ کسی وقت رہ چکی ہوگی اور ۸۵ فی صد قریب البلوغ افراد کا بھی یہی معاملہ ہوگا۔

[3] اسلامی روایات کا تحفظ، مصنفہ سید جمیل واسطی ایم۔ اے کنٹب صفحہ ۱۴۵، ۱۴۶۔

سبھی اس کی برائیاں بیان کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ مسلمانوں نے تو خاص اس موضوع پر شاید کوئی قابلِ ذکر کتاب ہی نہیں لکھی لیکن عیسائیوں نے اس کی برائیوں کو واشگاف کرنے کے لیے لاتعداد کتابیں لکھی ہیں اور عیسائی مشنریوں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائی ہیں، اور مبلغین پیدا کیے ہیں۔ ایک زبردست پروپیگنڈا ہے کہ ہر وقت جاری ہے۔ یہ پروپیگنڈا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بام اوج پر تھا۔

جان۔ اے۔ او۔ برین (پی ایچ۔ ڈی) نے اپنی کتاب میں فادر میتھیو کے بت کا ذکر کیا ہے، جو اس کی شراب کے خلاف مہم اور تبلیغ کو سراہتے ہوئے پبلک جگہ میں اس کی عزت افزائی کے لیے نصب کیا گیا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے:

"میتھیو نے آئرلینڈ میں اس زور شور سے اور اتنے مدلل طریق پر شراب نوشی کے خلاف تبلیغ کی کہ لوگ اس تحریک کے علمبردار بننے لگے اور الکوہل کے مشروبات سے کلیتہً مجتنب رہنے کی قسم کھانے لگے۔ پھر اس نے امریکہ جا کر اس جہاد کا سنٹر قائم کیا۔"

پچھلی صدی کے اندر امریکہ میں شراب کے خلاف زبردست عوامی تحریکیں چلیں تھی کہ عورتوں نے بھی اس میں بڑے انہماک سے حصہ لیا اور شراب اور بیئر کے پیپوں کو توڑ کر شراب کو ضائع کیا گیا۔ ان تحریکوں کے اثر سے حکومت نے ۱۸۵۱ء میں شراب کے استعمال اور اس کی کشید کو خلاف قانون قرار دے دیا۔

امریکن پریذیڈنٹ ہیز (۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۳ء) کی بیوی کا نام LAMONADE LUCY (لیموں والی لوسی) پڑ گیا، کیونکہ اس نے وہائٹ ہاؤس میں الکوہل کے مشروبات پینے سے انکار کر دیا۔ امریکن پریذیڈنٹ فلمور بھی نہ شراب پیتا تھا نہ سگریٹ۔ اور ایسے ہوٹل میں ٹھیرتا تھا جہاں شراب موجود نہ ہو۔ شراب پر پابندی کا قانون امریکہ میں ۱۸۵۱ء سے ۱۹۳۳ء تک نافذ رہا۔ (صرف دو سال (۱۸۵۵ء، ۱۸۵۶ء) اس سے مستثنیٰ رہے)۔

جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کم از کم دیہی امریکہ نے شراب کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں آدھی آبادی یا ملک کے تین چوتھائی حصہ نے شراب کو ختم کرنے کے لیے پورا زور لگایا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو یہ قانون نافذ ہوا کہ جس مشروب میں نصف فیصد سے زیادہ الکوہل ہو گی اس کے پینے یا بنانے والے کو سخت سزا دی جائے گی۔[۱]

۱۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں۔

BEER (بیئر) میں الکوہل ۴ سے ۸ فیصدی تک ہوتی ہے۔ گویا ہر قسم کی ہلکی سے ہلکی بیئر بھی خلافِ قانون ہو گئی۔ لیکن اس مہم میں بعض بنیادی خامیاں موجود تھیں، مثلاً قوم کو اخلاقی لحاظ سے پوری طرح تیار نہیں کیا گیا تھا، گرجاؤں میں شراب بدستور موجود اور ضروری تھی۔ ان وجوہ اور بعض دوسرے عوامل کی بنا پر آخر کار تقریباً بیاسی سال بعد ۱۹۳۳ء میں اس قانون کو واپس لے لیا گیا۔

موجودہ زمانے کا سب سے بڑا ماہرِ نفسیات سی۔ جی۔ ینگ (جو بقیدِ حیات ہے) لکھتا ہے:

"اور وہ تمام لوگ ہمارے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جن کے ملک پر ہم قبضہ کر لیتے ہیں اور خود ان کو جنسی امراض کا شکار اور شراب کا رسیا بنا کر صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیتے ہیں"[1]

گویا ینگ کے نزدیک کسی قوم میں شراب کو رواج دینا اس کو نیست و نابود کرنے کے مترادف ہے۔

مغرب میں بہت سی انجمنیں اور ادارے شراب کے خلاف کام کر رہے ہیں لیکن ان کا احاطہ یہاں ناممکن ہے۔ ہم نمونہ کے لیے صرف ایک ادارہ کا ذکر کریں گے۔

آج کل ALCOHOL ANONYMUS (گمنام الکوہل) نام کی تحریک مغربی ممالک میں سب سے زیادہ زور شور سے کام کر رہی ہے۔ اس کے ممبر اور کارکن وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی زمانے میں شراب کے رسیا رہ چکے ہیں اور اب اس سے پوری طرح کنارہ کش ہیں۔ یہ کارکن ان تمام لوگوں کی رہنمائی اور مدد رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں جو شراب کو نقصان دہ

(حاشیہ صفحہ ۱۱۸) [1] پکٹوریل ہسٹری آف امریکہ از ڈیوڈ ران، پریذیڈنٹ فلمور اور پریذیڈنٹ ہیز کی زندگیوں کے حالات کے تحت دیکھیے۔ واقعات کی تفصیلات کے لیے دیکھیے "امریکن پولیٹیکل اینڈ سوشل ہسٹری" از فاکنر FAULKWER صفحہ ۲۸۲، ۷۲۲، ۷۲۳، پانچواں ایڈیشن۔

مزید الذکر کتاب میں مختلف تصاویر بھی دی گئی ہیں جن میں سے ایک میں پانچ عورتیں بیئر کے پیپوں کو کلہاڑیوں سے توڑ توڑ کر بیئر کو بہا رہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک مرد کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے۔ یہ واقعہ انڈیانا ریلوے سٹیشن پر پیش آیا جس میں پورے CARGO کو برباد کر دیا گیا تھا۔ اسی کتاب میں صفحہ ۲۰۰ پر ایک تصویر دی گئی ہے جس میں امریکن پولیس ایک ہوٹل کو بند کرنے کا نوٹس لگا رہی ہے۔ جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں "یہ امتناعِ شراب کے قانون کی خلاف ورزی کے باعث سربمہر کر دی گئی۔"

[1] MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL by C.C JUNG P.246

سمجھتے ہوئے اس کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں اس کے ممبر ہیں۔ یہ لوگ پریس وغیرہ کے ذریعہ سے بھی شراب کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ ۱۹۳۳ء میں حکومت امریکہ نے شراب پر پابندی کا قانون واپس لیا اور ۱۹۳۴ء ہی میں ایک امریکن شرابی نے شراب سے توبہ کر کے اس ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ اسے (A. A) اے۔ اے کے مخفف نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۶۰ء میں ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ نے ایک معلوماتی مضمون اس کے متعلق لکھا تھا۔ ہم اس میں سے کچھ اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

"۲۵ سال قبل الکوہل ازم بری انسانی علتوں میں سے سب سے زیادہ یاس انگیز لت تھی۔ اس میں مبتلا لاکھوں لوگ ڈاکٹری سائنس کی نظر میں لاعلاج اچھوت تھے۔ آج ان کی قسمت پلٹ چکی ہے۔ اس وقت ڈھائی لاکھ پرانے شرابی کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں بہت سے تو ایسے ہیں جو ان لوگوں سے بھی بہتر شہری بن گئے ہیں جو کبھی پیتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس عجیب و غریب فتح اور کامرانی کا ڈاکٹری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس فتح کا سہرا ایک خدائی نظریے کے سر ہے۔ ان لوگوں کی کوئی باقاعدہ انجمن نہیں ہے اور یہ لوگ چندہ وصول کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ نام اور شہرت سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کی طاقت قربانی اور خاکساری میں پنہاں ہے۔

۱۹۳۴ء میں اس تحریک کا صرف ایک ممبر تھا۔ یہ شخص بہت ذہین اور بیدار مغز تھا لیکن شراب کے ہاتھوں تباہ حال تھا۔ "اے۔ اے" والے اس کو بِل (BILL) کا نام دیتے ہیں۔

آخر اس کی ملاقات ایک شرابی ایبی (EBBY) سے ہوئی جس نے اسے بتایا کہ اس کا علاج صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ انسان خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔

اس کے خاص الفاظ "SURRENDER TO GOD" تھے۔ یہی معنی حسنِ اتفاق سے اسلام کے بھی ہیں۔

لیکن بِل پکا منکرِ خدا تھا اور ایبی کے طریقہ علاج کے لیے مناسب نہ تھا۔ دوسری عجیب بات یہ تھی کہ ایبی ایک ایسا مشنری تھا جو خود بھی شراب پر قابو نہ پا سکا تھا[1]۔ اگرچہ جس وقت

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی بے عمل کی تبلیغ بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔

اس نے یہ بات کہی تھی اس وقت وہ نشہ میں نہ تھا۔

ان سب چیزوں کے باوجود بل شراب کے نقصانات کو جانتا تھا اور اس لیے شراب پر قابو پانے کا خواہشمند تھا جو اس کو دن بدن تباہی کی طرف لیے جا رہی تھی۔

اچانک ایک دن وہ پکار اٹھا کہ اگر خدا کہیں ہے تو وہ میرے سامنے آئے۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ یکدم اس نے محسوس کیا کہ کمرہ میں روشنی ہے اور پھر اس پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب آزاد آدمی ہے اور شراب کے بھوت سے آزاد ہو چکا ہے[ل]۔ اس کو کسی بالاتر ہستی کی موجودگی کا شدید احساس ہوا۔ پھر بل خوفزدہ ہو گیا۔ کیونکہ اس کی سائنسی تعلیم نے اس کو یاد دلایا کہ وہ کسی (HALUCINATION) وہم میں گرفتار ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ وہ کسی اور ڈاکٹر کے بجائے خاص طور سے ڈاکٹر ولیم ڈنکن سلک ورتھ ہی کے پاس جائے۔ یہ ڈاکٹر اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اکثر الکوہل ازم والوں کے لیے ڈاکٹروں کے پاس کوئی امید کی کرن نہیں ہے اسی وجہ سے اس کو میکشوں سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ بل نے اس ڈاکٹر کو گھبراتے ہوئے بتایا کہ وہ مخبوط الحواس ہو گیا ہے ڈاکٹر نے اس سے سوال و جواب کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یہ فی الواقع ایک روحانی تجربہ تھا۔

اب بل نے دوسرے الکوہل ازم والے لوگوں پر تبلیغ شروع کر دی۔ لیکن اسے چھ مہینے تک کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ پھر اس کے ڈاکٹر نے اس کو بتایا کہ تبلیغ سے یہ لوگ ٹھیک نہ ہوں گے زمین کو ہموار کرنا اولین چیز ہے۔ پہلے ان کو ڈراؤ اور بتاؤ کہ یہ لوگ اگر شراب پیتے رہے تو یہ یا تو پاگل ہو جائیں گے یا مر جائیں گے۔ تمہاری سب باتیں یہ لوگ غور سے سنیں گے۔ کیونکہ تم پر یہ سب کچھ بیت چکا ہے۔ اس کے بعد تم ان کو غذائی علاج کے متعلق بتانا۔ اس طریقے پر کام کر کے اس نے سب سے

[ل] خدا کی غلامی سے ہی ہر دوسری غلامی سے آزادی حاصل ہوتی ہے ۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پہلے ڈاکٹر باب (BOB) کو تبدیل کیا۔ پھر دونوں نے مل کر کام شروع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد تین ہو گئی اور یہ A-A کا پہلا گروپ تھا۔ ۱۹۳۹ء تک یہ لوگ سو ایسے آدمیوں کو راہِ راست پر لے آئے جو نشہ کی انتہائی پستیوں تک پہنچ چکے تھے۔ پھر انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام الکوہل (ALCOHOL ANONYMUS) تھا۔ اس میں انہوں نے بارہ ۱۲ اصولی درجوں کا ذکر کیا ہے جن کا اختصار مندرجۂ ذیل ہے۔

۱۔ شراب کو بالکل چھوڑ دینے کی خواہش پیدا کرو۔

۲۔ یہ تسلیم کرو کہ تم تنہا ایسا کرنے پر قادر نہیں ہو۔ (یہ سب سے مشکل درجہ ہے)

۳۔ ذاتی عیبوں کا بھرپور اقرار کرو۔

۴۔ دوسروں کی مدد کرنے کا بھی تہیہ کرو۔

۵۔ خدا کی ہر وقت موجود مدد مانگو۔

۶۔ خداوندی مدد کو قبول اور تسلیم کرو۔

شروع شروع میں اطباء ایک ایسے طریقہ کے سُود مند ہونے کے متعلق شک میں رہے جو کسی طرح بھی سائنٹیفک نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر اس کو تسلیم کرتے گئے اور تعاون بڑھتا رہا۔

ایک مشہور طبیب نفسیات (PSYCHIATRIST) ڈاکٹر ہیری ٹائی باوٹ الکوہل ازم کے مریضوں کے سائنٹیفک طریقہ علاج میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا تھا۔ ایک دن اس کی ایک مریضہ مذکورہ تحریک کے افراد سے پہلی ملاقات کے بعد اس کے پاس آئی اور اس کو کہنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے تریاق مل گیا ہے۔ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گی۔ اور پھر سچ مچ اس نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس عورت اور دیگر اصلاح یاب لوگوں نے ڈاکٹر ٹائی باوٹ کو بتایا کہ کس طرح انہوں نے ایک عظیم طاقت یعنی خدا کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن سب سے پہلے "گمنام الکوہل" والے ان لوگوں سے ان کی بیچارگی کا اقرار کرواتے۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ شرابی یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود

اس عادت پر قابو پا سکتا ہے۔ جب ان کو بیماری کا احساس ہو جاتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ وہ دو میں سے ایک چیز اختیار کر سکتے ہیں۔ پاگل ہو کر موت کی آغوش میں سو جائیں یا چاہیں تو خدا کی طرف ترقی کرنے لگیں۔ جب وہ خدا کو پسند کر لیتے ہیں تو پھر وہ شراب نہیں پی سکتے۔ بس یہ اتنی سی آسان بات ہے۔

بل اور راب کام کرتے رہے۔ تبدیلی سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ انسان مکمل طور پر ہمیشہ کے لیے شراب کو ترک کر دے۔ چھ سال کے عرصہ میں انہوں نے دو ہزار لوگوں کو آزاد کرا لیا تھا اور ساتویں سال کے آخر تک آٹھ ہزار آدمی آزاد تھے۔ ان کی عظیم کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہر تبدیل شدہ انسان ایک مبلغ تھا جو خود صحت مند ہونے کے بعد دوسروں کی مدد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ ان لوگوں کی کایا بالکل پلٹ جاتی ہے۔ شخصی افتخار و امتیاز کو بھول کر بالکل خاکسار بن جاتے ہیں اور صرف مریض کے لواحقین سے اپنا تعارف کراتے ہیں۔ ورنہ ریڈیو، ٹیلی وژن یا پریس سے دور بھاگتے ہیں۔ آخر کار ڈاکٹروں نے اس تحریک کی تصدیق کرنی شروع کی اور ان کے طریق علاج کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔

ڈاکٹر لوگ الکوہل ازم میں مبتلا ہزاروں لوگوں کو "اے۔ اے" کے پاس بھیج رہے ہیں۔ ڈاکٹر سخت عادی ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو اس ادارے سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ وہ ان سے کہتے ہیں کہ شراب کی علت کے باوجود اگر ابھی تک ان کی نوکری اور کام کاج محفوظ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خطرہ میں نہیں ہیں۔

بل کا کہنا ہے کہ ہمارے کل افراد میں سے ½ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو ڈاکٹروں نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ان لوگوں کی کل تعداد امریکہ میں آج کل (یعنی ۱۹۶۰ء) میں ۲۵۰،۰۰۰ ہے۔ ۷۵ فیصد لوگ شراب کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر تندرست ہو جاتے ہیں۔ راک فیلر کے ایک ساتھی نے کہا کہ اے، اے پہلی صدی عیسوی کی عیسائیت ہے۔ اس صدی ہی میں عیسائیت نے دنیا کو بغیر پیسے کی مدد کے تبدیل کر دیا تھا۔ انگلینڈ میں ۴۵۰۰ سابق شرابی اے، اے کی میٹنگ میں ۴

مطبُوعات

تفسیر ماجدی جلد اوّل ۔طبع ثانی تالیف: مولانا عبدالماجد دریابادی ۔شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔ قیمت اٹھارہ روپے۔ صفحات ۴۹۰ -

اِس قابلِ قدر تفسیر کے نقش اوّل پر تبصرہ ترجمان القرآن کے صفحات میں غالباً آچکا ہے ۔ یہ اس کا نقشِ ثانی ہے اور مواد اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے سے بہتر ہے ۔ مولانا نے اس میں بیش قیمت اضافے کرکے اس کی افادیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے ۔ یہ تفسیر ہر لحاظ سے فاضل مصنّف کا علمی اور ادبی شاہکار ہے ۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف مولانا کے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ بلکہ جدید مسائل سے واقفیت کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ وہ چونکہ تشکیک کی ان ساری راہوں سے خود گزر چکے ہیں، جن سے آج کا مسلمان نوجوان بالعموم گزرتا ہے ۔ اس لیے انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اُن کانٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔ قرآنی واقعات وقصص اور مقامات و امکنہ نیز اشخاص واقوام اور مذاہب اور فرق سے متعلق انہوں نے اتنی مستند معلومات فراہم کر دی ہیں جو یکجا نہیں مل سکتیں ۔ پھر خوبی یہ ہے کہ کسی مقام پر بھی وہ سلف سے نہیں ہٹے ۔ جو بات کہی ہے اس کے لیے علما نے سلف سے استناد کیا ہے ۔

زیرِ تبصرہ کتاب اس کی صرف پہلی جلد ہے جو سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پر مشتمل

بقیہ : شراب وقمار

باقاعدہ آتے ہیں ۔اس کے برطانیہ میں ۱۵۰ مراکز ہیں ۔تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبہ میں اس کا سنٹر موجود ہے اور عام طور سے ان کا ٹیلیفون نمبر بھی ڈائرکٹریوں میں ALCOHOL NONYMUS کے تحت ہوتا ہے تاکہ لوگ استفادہ کر سکیں ۔"

(باقی)

ہے۔ پاکستان میں یہ مندرجہ ذیل مقامات سے مل سکتی ہے۔ فیروز سنز۔ مال روڈ، لاہور۔ پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی لاہور، حمیدیہ لائبریری ڈھاکہ اور یونیورسٹی بک ڈپو۔ پشاور۔ کتاب میں فہرست مضامین اور اشاریہ کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔

معیار طباعت اور کتابت عمدہ ہے۔

ارشادات رسول | مرتبہ۔ جناب ظفر اللہ خاں۔ شائع کردہ ۱۔ المحراب۔ سمن آباد۔ لاہور۔ ہدیہ فی کتاب ڈیڑھ روپیہ۔

اس مختصر سی کتاب میں فاضل مرتب نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو جمع کیا ہے۔ حضورؐ کے ارشادات یوں تو ہر فرد کے لیے نورِ ہدایت ہیں لیکن یہ مختصر سا مجموعہ بچوں اور بچیوں کے لیے بڑا مفید ہے طباعت رنگین اور دیدہ زیب ہے۔

THE WOUNDS SPEAK
زخموں کی زبان میں | تالیف۔ جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب۔ مترجم: القاضی۔ شائع کردہ سیارہ پبلیکیشنز ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور۔

نعیم صدیقی صاحب کو باری تعالیٰ نے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے دلِ حساس نے اسرائیلی جارحیت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر اُن کے زوردار قلم نے اسے نظم کی صورت میں ڈھالا اب اس نظم کو القاضی نے بڑی عمدگی کے ساتھ انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ محترمہ مریم جمیلہ اور تعارف جناب محمد یوسف صاحب نے لکھا ہے اور سیارہ پبلیکیشنز نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اچھے ایڈیشن کی قیمت پونے دو روپے اور سستے ایڈیشن کی قیمت سوا روپیہ ہے۔

فری میسنری FREE MASONARY | تالیف: جناب مصباح الاسلام فاروقی۔ شائع کردہ: کلچر سٹڈیز سرکل، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۷۹۔ ناظم آباد۔ کراچی نمبر ۱۸۔

"یہودی سازش اور دنیائے اسلام" کے فاضل مصنف نے زیر تبصرہ کتاب میں یہودی بین الاقوامی تنظیم فری میسنری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کے ان پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے جو ابھی تک عام لوگوں کی

آنکھوں سے مستور تھے۔ یہ ایک بالکل خفیہ تنظیم ہے۔ فاروقی صاحب نے بڑی محنت کے ساتھ اس کے پُراسرار حالات کا کھوج لگایا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اگرچہ بعض حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں لیکن اس کا سب سے قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ فاضل مصنّف نے ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس تنظیم کے کام کا جائزہ لیا ہے۔ اور امتِ مسلمہ کو سوچنے کی دعوت دی ہے۔

کتاب کے اعلیٰ اڈیشن کی قیمت سوا دو روپے اور سستے اڈیشن کی قیمت سوا روپیہ ہے۔ معیارِ طباعت اُونچا ہے۔

(بقیہ اشارات)

فحاشی کا جو سیلاب تیزی سے امنڈ رہا ہے اسے ملک کا ہر سنجیدہ طبقہ بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور شدت سے یہ خطرہ محسوس کر رہا ہے کہ یہ سیلاب اُسے برق رفتاری کے ساتھ تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ حکومت اس سلسلے میں جو قدم بھی اٹھائے اُسے ہر طبقے کی طرف سے بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔ اس معاملے میں تقریباً سارے طبقوں کی طرف سے حکومت کو بارہا متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کی فکر کرے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ نہ صرف لوگوں کی کسی بات اور کسی مطالبے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا بلکہ آئے دن منکرات کو پھیلانے کی نئی نئی اسکیمیں سامنے آتی رہتی ہیں۔

انسانی اخلاق کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی ایسا معاشرہ معرضِ وجود میں نہیں آیا جو یک زوجگی کے رواج کے ساتھ عوام کے اخلاق کی حفاظت کرنے میں بھی پوری طرح کامیاب ہُوا ہو۔ جن معاشروں میں تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کی گئی ان میں لازمی طور پر قحبہ خانوں اور اسی نوعیت کی دوسری حرام کاریوں نے جنم لیا۔ فحاشی کے خلاف کامیاب جنگ لڑنے والے وہی معاشرے تھے جن میں ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت تھی۔ ول ڈیوران

WILL DURANT یورپ کا ایک ایسا مفکر ہے جسے مذہب سے کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں اور جسے اسلام سے خاص طور پر کد ہے۔ وہ بھی اپنی کتاب "تاریخ کی کہانی" جلد پنجم میں انسانی فطرت پر بحث کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتا ہے کہ تعدد ازواج مرد کا فطری تقاضا ہے اور غیر معمولی محنت اور ریاضت کے بعد ہی اسے اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بیوی پر قناعت بھی کرے اور پھر اپنے اخلاق کی پوری طرح محافظت کرنے میں بھی کامیاب ہو۔ ذرا اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"انسان کا فطری میلان تعداد ازواج کی طرف ہے، اور سخت اور مضبوط اخلاقی ضابطے معقول اور مناسب درجہ کا افلاس اور بیوی کی مسلسل اور پیہم نگرانی ہی اسے یک زوجگی کی طرف مائل کر سکتی ہے۔" (ص۵۵)

اس کے بعد مصنف نے خود اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ تعدد ازواج کے خلاف جب یورپ میں یک زوجگی کی تحریک نے زور پکڑا تو مردوں نے صنفی جذبات کی تسکین کے لیے دیگر ذرائع پیدا کر لیے۔ خاتون دوستی، صحبت ہم جنس اور صنفی آوارگی کا طوفان اٹھا اور مردوں نے منکوحہ عورتیں گھر میں آباد کرنے کے بجائے داشتاؤں کی پرورش شروع کی۔

قرآن و سنت کے احکام اور تاریخ کے فیصلے بالکل کھلے طور پر ہمارے سامنے ہیں مگر ہماری حکومت نے ان میں سے کسی پر توجہ نہ دی اور نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر تعدد ازواج پر بعض ناروا پابندیاں عاید کر دیں۔ اور اس کے ساتھ ہی خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے معاشی محاسن و معائب کیا ہیں یہ ایک مستقل بحث ہے۔ البتہ اس سے نوجوان نسل کے اخلاق پر جو اثر پڑا ہے اس سے حکومت اور عوام دونوں بے خبر نہیں ہیں۔ اس تحریک کے سرگرم کارکنوں نے اس بات کا رونا رویا ہے کہ تحدید نسل کے لیے جو ادویہ اور دوسرے ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں ان سے شادی شدہ لوگوں کی بہ نسبت غیر شادی شدہ افراد زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ملک میں صنفی انارکی کا طوفان اٹھ رہا ہے۔

پھر نوخیز نسلوں کی اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہیں بلکہ آرٹ اور ثقافت کے نام پر جگہ جگہ جو انجمنیں اور ادارے قائم کیے جا رہے ہیں وہ نئی نسلوں میں اخلاقی بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ ان اداروں کی حکومت سرپرستی

کرتی ہے اور باقاعدہ مالی امداد دیتی ہے۔ ان کی تقریبات میں وزرائے کرام اور خود صدرِ مملکت شرکت فرماتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

کاش اللہ اور اُس کے رسول کے فدائی اور کلامِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ کے شیدائی صدرِ مملکت کبھی تنہائی میں بیٹھ کر ایمان کی محبت کے بنیادی تقاضوں اور جو کچھ اس ملک میں علماء دین کے ساتھ ہو رہا ہے اُس پر غور کریں۔ اُن کے اس بیان کے پیشِ نظر ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری اس تلخ نوائی پر برہم ہونے کے بجائے اس پر ٹھنڈے دل سے سوچیں گے اور یہ دیکھنے کے بجائے کہ کون یہ باتیں کہہ رہا ہے، یہ دیکھیں گے کہ آیا جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں اس ملک کی اور خود ان کی اپنی بھلائی ہے یا نہیں۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہماری ان گزارشات کے پیچھے بجز خدا کی بارگاہ میں اپنی ذمہ داری کے احساس اور صدرِ مملکت کی حقیقی خیر خواہی کے اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔
